کوئی ایسا شہر بساؤں میں

نگہت سیما

کوئی شہر ایسا بسا او من میں

نگہت سیما

سیمل نے نظروں سے اوجھل ہوتے پوائنٹ کو دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہ اسٹاپ پر تنہا کھڑی تھی۔ چادر کے پلو سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پھر اپنے اطراف نظر دوڑائی۔ سڑک دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ اسٹاپ خالی تھا لیکن دائیں طرف درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑے دو لڑکے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تنگ جینز اور دھاری دار شرٹس میں ملبوس یہ لڑکے اسٹوڈنٹ تو ہرگز نہیں لگ رہے تھے۔ ایک لڑکا بڑے لوفرانہ انداز میں سگریٹ پیتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے بنا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر فوراً نظریں ان پر سے ہٹالیں اور سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔

ایک تو آج حسنہ بھی نہیں آئی تھی دوسرے لائبریری میں ناول پڑھتے ہوئے اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا اور آخری پوائنٹ بھی نکل گیا تھا اور اب خوف سے اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی ہر وقت ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی رہنے والی۔ یونیورسٹی میں پڑھنے کے باوجود اس میں خود اعتمادی کی بے حد کمی تھی اگر حسنہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی بھی یونیورسٹی میں پڑھنے کی ہمت نہ کر پاتی بلکہ اس نے تو گریجویشن کے بعد تعلیم کو اپنی طرف سے خیرباد کہہ دیا تھا۔ یہ تو حسنہ تھی جو اسے گھسیٹ کر یونیورسٹی لے آئی تھی۔

دور سڑک سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی جو اسٹاپ کے قریب آ کر آہستہ ہوئی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔

"کدھر جانا ہے؟"

اس کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔

"ٹیکسی میں اکیلے کبھی نہ بیٹھنا، کبھی تنہا آنا پڑے تو بس اور ویگن سے ہی آنا بلکہ رکشے میں بھی اکیلے مت بیٹھنا۔" اماں نے سیکڑوں بار ہی تو اسے منع کیا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دائیں طرف دیکھا۔ سگریٹ پینے والے لڑکے نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسلا اور دوسرے لڑکے کی طرف دیکھا۔ دونوں زور سے ہنس پڑے اور دونوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اب وہ شاید اسی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ بالکل ناک کی سیدھ میں سامنے دیکھ رہی تھی۔ لیکن پسینہ ایک بار پھر اس کے مساموں سے پھوٹ پڑا تھا اور اس نے اپنی ٹانگوں میں واضح لرزش محسوس کی تھی۔ ایک رکشا شور مچاتا ہوا سڑک پر سے گزر گیا۔ رکشے کے پیچھے
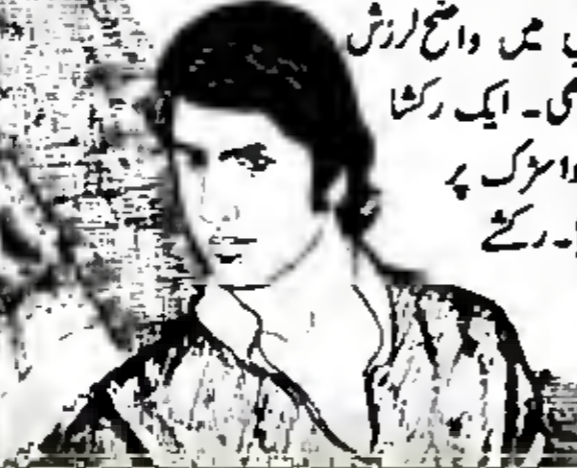
کہیں سے ایک تانگہ بھی آرہا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اس کے کانوں میں بہت زور سے آرہی تھی۔ تانگا اسٹاپ پر رکے بغیر گزر گیا۔ اس میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ افراد بھرے ہوئے تھے۔ تانگا جا چکا تھا اور روڈ کراس کر کے دو لڑکیاں اسی طرف آرہی تھیں۔ لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی ہمت تھوڑی بحال ہوئی تھی۔ وہ بیگ گلے میں ڈالے کندھوں پر شولڈر بیگ لٹکائے بڑے اعتماد سے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے وہ سڑک کراس کر کے اس کے قریب آکھڑی ہوگئیں۔ وہ اس سے بے نیاز ایک دوسرے سے باتوں میں مگن تھیں۔ ان کا موضوع گفتگو ان کا باس تھا جو کسی فلمی ہیرو کی طرح تھا لیکن وہ اپنی ورکر لڑکیوں کو ذرا بھی لفٹ نہیں کرواتا تھا اور ذرا سی غلطی پر بے عزتی کر کے رکھ دیتا تھا۔

"کاش زندگی کوئی افسانہ یا ڈراما ہوتی۔" ایک لڑکی نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"اور اس افسانے میں باس آپ پر دل و جان سے فدا ہو جاتے۔" دوسری لڑکی نے تبصرہ کیا۔

اس سے پہلے کہ پہلی لڑکی کوئی جواب دیتی پھٹ پھٹ کرتا ہوا رکشا آیا اور دونوں لڑکیاں اس میں سوار ہو کر چل دیں۔ لڑکیوں کی باتوں میں کھو کر کچھ دیر کے لیے وہ اردگرد کے ماحول سے غافل ہوگئی تھی۔ لڑکے پھر درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے تھے اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں انہیں دیکھا ایک بار پھر وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی طرف آرہے تھے۔ قلفی بیچنے والا ایک لڑکا کہیں سے آکر بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنا تھرموس اپنے پاؤں کے پاس رکھا تھا اور اب کندھے پر پڑے رومال سے اپنا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کی نظریں لڑکے کے پاؤں پر گئیں۔ مٹی اور دھول سے اٹے پاؤں میں ایک ہوائی چپل تھی جس کے بائیں پیر میں ایک طرف چمڑے کا ننھا سا ٹکڑا تھا۔ گویا چپل کو موچی سے مرمت کروایا گیا تھا۔ لڑکے کے آنے سے شاید اسے ڈھارس ملی تھی کہ ایک بار پھر وہ اردگرد سے بے خبر ہوگئی تھی۔ اس کی نظریں کبھی لڑکے کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف اٹھتیں اور کبھی اس کے ہوائی چپل میں قید پاؤں کی طرف اور اماں کی آواز ایک بار پھر اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

"سیمل چندا شکری نہ کیا کر..... ناراض مت ہوا کر اللہ سے۔ وہ تو بڑا مہربان ہے۔ میری جان جس نے تمہیں چھت دی ہے، باپ اور بھائی کا سائبان دیا ہے، یہ محفوظ چار دیواری دی ہے۔ تمہیں سب کچھ بن مانگے مل جاتا ہے، کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑتا۔ مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ وہ بھی تو ہیں میری جان جنہیں دو وقت پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔"

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" پتا نہیں کتنے سالوں بعد یہاں اس سڑک پر کھڑے کھڑے اس نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا ورنہ اسے تو اللہ سے بے حد بے حساب شکوے تھے۔

اور یہ لڑکا بے چارہ کتنی عمر ہوگی اس کی حد سے حد گیارہ سال اور اس تپتی دوپہر میں یہ قلفیاں بیچ کر پیٹ کے رزق کا بندوبست کر رہا ہے اور پتا نہیں یہ اتنا کما بھی لیتا ہوگا کہ اس کا اور اس کے خاندان والوں کا پیٹ بھر سکے اور دوسری ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

"تمہاری قلفیاں بک گئیں ساری.....؟"

"نہیں، آپ لیں گی۔" اس کی آنکھوں میں یکدم چمک پیدا ہوئی تھی۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ لڑکا یکدم اس سے بے نیاز ہو کر اپنے رومال سے اپنا تھرماس صاف کرنے لگا تو اسے افسوس ہوا کہ کم از کم وہ اس سے ایک قلفی تو خرید ہی لیتی بھلے نہ کھاتی۔ وہ اتنا ناپ نہ ہوتا لیکن اس کا ارادہ تو محض اس سے باتیں کرنے کا تھا وہ اس سے اس کی اس محنت مشقت کے متعلق اور اس کی فیملی کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی۔ لڑکا جیسے اس کے قلفی نہ خریدنے پر ناراض سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے دائیں کندھے پر لٹکا شولڈر بیگ کندھے سے اتارا اور اس کی زپ کھول کر کاغذات کے انبار سے دس روپے کا نوٹ تلاش کر کے سر اونچا کیا تو لڑکا تھرماس اٹھائے سڑک کراس کر رہا تھا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑے لڑکے اب اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خباثت تھی اور ہونٹوں پر بڑی لوفرانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور بالکل بینچ کے ساتھ جڑی کھڑی تھی اور دل ہی دل میں آیت الکرسی اور جتنی بھی قرآنی آیات یاد تھیں پڑھ رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی اس کی نظریں زمین پر جمی تھیں اور وہ دعا کر رہی تھی۔

"یا اللہ کوئی ویگن کوئی بس آجائے یا پھر کوئی سواری آجائے۔" اسے ان دونوں لڑکوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا تھا اور پھر ایک لڑکا پیچھے ہٹ کر بالکل اس کے ساتھ جڑ کر یوں کھڑا ہوا تھا کہ اس کا بازو اس کے شولڈر بیگ سے ٹکرایا تھا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر لڑکے کو گھورا۔

"پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو۔" لیکن اپنی آواز کی لرزش خود اس سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔

"کیوں جی یہ جگہ آپ کے ابا جان نے الاٹ کروائی ہے۔" لڑکے کی آنکھوں میں خباثت تھی اور سیمل کو اس کے سوا اور کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ یہاں سے اگلے اسٹاپ پر جا کر بس یا ویگن کا انتظار کرلے۔

"یہ خیال مجھے پہلے ہی آجانا چاہیے تھا۔" خود کو کوستے ہوئے اس نے بائیں طرف رخ موڑا اور تیزی سے چلنے لگی لیکن ابھی چند ہی قدم چلی تھی کہ ایک لڑکے نے تیزی سے اس کے پیچھے آکر اس کی چادر کھینچی۔

"اے کبوتری کہاں چلی ہو، کیا کسی اور کا انتظار تھا؟"

"شٹ اپ۔" غصے سے اس کا رنگ سرخ ہوا لیکن اس کی آواز حلق سے باہر نہیں نکلی تھی۔

"جب تم اکیلی گھر سے نکلو گی تو راہ میں کئی آوازے کسنے والے ملیں گے۔ تم انہیں جواب دینے کے لیے مت رک جانا۔ کتوں کو تو بھونکنے کی عادت ہوتی ہے گڑیا۔" اماں نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"میرا پلو چھوڑو۔" اس نے لہجہ مضبوط بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس میں بری طرح ناکام ہوگئی تھی۔

"اور اگر نہ چھوڑوں تو۔" اب دوسرا لڑکا بھی قریب آگیا تھا اور بڑے بے ہودہ انداز میں ہنس رہا تھا۔

"تو.....!" اس نے ہراساں نظروں سے سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ تب ہی کسی بائیک کے بریک سڑک پر چرچرائے تھے اور کوئی بائیک سے اتر کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

"بے بی تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔" اس نے قدرے فاصلے سے ہی چلا کر پوچھا تھا اور اس نے بے حد گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ دراز قد تھا، رنگت سانولی تھی، بال فوجی کٹ تھے اور آنکھیں—— ہاں آنکھیں بہت خوابناک تھیں اور ان خوابناک آنکھوں پر پہرا دیتی بے حد گھنی اور مڑی ہوئی پلکیں۔

وہ تھوڑے سے ہونٹ وا کیے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی یادداشت میں کہیں بھی اس جیسے حلیے اور شکل صورت والا کوئی شخص نہیں تھا بلکہ اس کی یادداشت کے خانے میں کوئی اجنبی مرد تھا ہی نہیں پھر

یہ کون تھا اور اسے اتنی بے تکلفی سے کیوں بلا رہا تھا لیکن نہیں اس نے سیم کہا تھا...... اور میرا نام تو سیمل ہے۔ یقیناً اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن یہ ان کا ساتھی بھی تو ہو سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ پھر گھبرا کر سہمی ہوئی سی سڑک کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اتنے میں وہ قریب آچکا تھا۔ اسے قریب آتے دیکھ کر لڑکے نے اس کی چادر کا پلو چھوڑ دیا تھا لیکن اس نے شاید دیکھ لیا تھا اس لیے اس نے ڈپٹ کر لڑکے سے پوچھا۔

"اے یہاں کیا کر رہے ہو تم؟"

"وہ سر...... اپنی وین کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" اس نے ایک الٹا ہاتھ لڑکے کے چہرے پر مارا۔

"دیکھ چکا ہوں میں تمہاری حرکت...... جی تو یہی چاہتا ہے کہ ابھی پکڑ کر تھانے میں بند کروا دوں لیکن...... بھاگو یہاں سے۔" وہ دونوں لمحوں میں غائب ہو گئے تھے۔ اب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"آپ نے غالباً گھر جانا ہے۔"

"جی......" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اب یہ پتا نہیں کون تھا اور کیوں......

"آئیں میں آپ کو گھر پہنچا دیتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ یکدم سہم کر پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کی کشادہ آنکھیں کچھ اور کشادہ ہو گئی تھیں اور ان سیاہ پتلیوں میں تیرتا خوف صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ یوں جیسے شکاریوں کے خوف سے بھاگی ہوئی ہرنی...... اس کی غزال آنکھوں میں ٹھہرا سہم ایسا ہی تھا۔

"آپ نے غالباً مجھے پہچانا نہیں۔" اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلا یا

"میں نوشیرواں ہوں۔"

سیمل کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ وہ تو اس نام کے کسی بندے کو نہیں جانتی تھی۔

"نوشیرواں عادل......" اس نے دُہرایا۔

وہ تو صرف ایک ہی نوشیرواں کو جانتی تھی جو اپنے عدل کی وجہ سے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گیا تھا۔ اور یہ کہاں تاریخ کے صفحوں سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"آپ کا پڑوسی...... میراں اماں کا نواسا۔"

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

سیمل کو لگا جیسے اس کی ٹانگوں نے لرزنا بند کر دیا ہو...... تو یہ میراں اماں کا نواسا تھا۔ میراں اماں کو ان کے پڑوس میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا یہی کچھ چھ سات ماہ ہوئے تھے لیکن ان چھ سات ماہ میں وہ محلے کی ہر دلعزیز شخصیت بن چکی تھیں۔ ہر ایک سے محبت سے پیش آتی تھیں۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھیں۔ ہر ایک کی ہمدرد تھیں اور یہ ان کا نواسا...... اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ اس نے ایک دو بار گلی میں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور اسے صرف اس کا دراز قد یاد تھا بس......

"پہچانا......؟"

اس نے سر ہلا دیا۔

"تو پھر چلیں؟"

"نہیں۔" اسی تیزی کے ساتھ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیوں آپ کو اعتماد نہیں ہے مجھ پر؟"

اس نے پہلے نفی میں سر ہلایا پھر فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ یک دم ہنس دیا اور سیمل نے دیکھا کہ اس کے دانت بہت خوب صورت تھے ایک دم ہموار ذرا ذرا سے وقفے پر۔

اور اماں کہتی تھیں جس شخص کے دانتوں میں یہ ذرا ذرا سا خلا ہو وہ بڑا خوش نصیب ہوتا ہے۔ اب پتا نہیں وہ خوش قسمت تھا یا نہیں لیکن ان دانتوں نے اس کی مسکراہٹ کو بہت خوب صورت بنا دیا تھا۔

"ایک بات کہیں نا سیم ہاں یا نہیں۔"

"میرا نام سیم نہیں ہے۔" وہ اب قدرے اعتماد سے کھڑی تھی۔

"اچھا میں سمجھا سیم ہے، اس روز میراں اماں آپ کو دیوار سے آواز دے رہی تھیں اور میں اندر کمرے میں ایف ایم ہنڈرڈ سے پرانے گانے سن رہا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے آپ کو سیم کہہ کر بلایا ہو کیونکہ کچھ دیر بعد آپ ہی دیوار پر نمودار ہوئی تھیں۔"

یہ شخص کس قدر باتونی ہے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ کمرے میں بیٹھا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔"

"میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟" اسے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"نہیں...... لیکن میرا نام آپ نے غلط سنا تھا۔ میرا نام سیمل ہے۔"

"سیمل۔" اس نے دُہرایا۔ "کتنا خوب صورت نام ہے لیکن اگر میں آپ کو سیم کہہ کر بلایا کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔"

"لیکن کیا ضروری ہے کہ میری اور آپ کی پھر کبھی ملاقات ہو۔" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"امکانات تو ہو سکتے ہیں سیم...... ایک محلے میں رہتے ہیں بلکہ دیوار سے دیوار ملی ہے اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کسی روز پھر آپ کا پوائنٹ چھوٹ جائے۔"

ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر اس وقت کوئی بس یا وین آجاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس نے سڑک پر نظر دوڑائی۔ اب رکشے، کاریں اور بائیک تو گزر رہے تھے لیکن کسی بس یا وین کا نشان تک نہیں تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے۔" اس نے اسے سڑک پر نظر دوڑاتے دیکھ کر پوچھا تو وہ چونکی۔

"کیسا خیال؟"

"میرے ساتھ چلنے کا۔"

"میں اسے مناسب نہیں سمجھتی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں تو میں گھر ہی جا رہا تھا لیکن خیر آپ نہیں جانا چاہتیں تو۔" وہ اس سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اس اثنا میں ایک بوڑھا بھی آکر بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے دو تین بار اس کی طرف دیکھا، وہ اس سے بے نیاز سا کھڑا سامنے سڑک پر دیکھ رہا تھا اور اگر اس نے اس بات پر برا مان لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر گھر نہیں گئی تو مانتا رہے برا۔ وہ تو زندگی بھر کبھی بائیک پر نہیں بیٹھی تھی مروان اور ابا کے ساتھ بھی نہیں حالانکہ جب مروان نے نئی نئی بائیک لی تھی تو اس نے کتنا کہا تھا اس سے کہ وہ اسے بائیک کی سیر کروا لائے لیکن اس نے تو صاف منع کر دیا تھا اور یہ تو اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ غیر اور نامحرم ابا دیکھ لیتے تو اسے زمانہ جاہلیت کی طرح زندہ گاڑ دیتے۔ اس نے ایک جھرجھری سی لے کر اس کی طرف دیکھا اور عین اس لمحے اس نے بھی اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"سیم تمہاری وین آرہی ہے۔" اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک پر دیکھا لیکن کوئی وین نہیں آئی تھی۔

"کیا اسے الہام ہوا ہے۔" وہ جھنجلائی اور اس نے سوچا۔ "اب کوئی بھی خالی رکشا نظر آیا تو میں اس میں بیٹھ جاؤں گی۔ اب ضروری تو نہیں کہ وہ مجھے بھگا کر لے جائے۔ آخر یہ روز سیکڑوں لڑکیاں اور عورتیں

رکشے میں تنہا سفر کرتی ہیں۔ یہ اماں نے ہی مجھے ڈرا ڈرا کر بالکل ہی بزدل بنا دیا ہے۔" اور جونہی اس نے ایک قدم آگے بڑھایا دور سے اسے وین آتی نظر آئی۔ وہ بے اختیار روڈ کی طرف لپکی۔ چند لمحوں میں وین وہاں کھڑی تھی اور یہ اس کی مطلوبہ وین تھی آٹھ نمبر جو سیدھی اس کے گھر کے نزدیک ترین اسٹاپ پر رکتی تھی۔ وین کے پائدان پر قدم رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر اسے دیکھا وہ اپنی بائیک کی طرف جا رہا تھا جو ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اس کی طرف دیکھتی وہ بائیک پر بیٹھ چکا تھا اور پائدان پر کھڑا کنڈیکٹر کہہ رہا تھا۔

"اندر جاؤ باجی...... سیٹ آگے خالی ہے۔" وہ جلدی سے خالی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کھڑکی میں سے اس نے دیکھا۔ وہ بائیک پر بیٹھا شاید وین کے چلنے کا انتظار کر رہا تھا جو بوڑھے کے لیے رکی ہوئی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا وین کی طرف آ رہا تھا۔ بوڑھے کے وین میں بیٹھتے ہی وین چل پڑی اور اس نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے شولڈر بیگ کندھے سے اتار کر گود میں رکھا اور کرایہ نکالنے لگی۔

☆☆☆

وہ لاؤنج سے اوپر جاتی سیڑھیوں کے نیچے بنی الماری کے ساتھ چپکی کھڑی تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے موجود خلا کے تقریباً ایک تہائی حصے پر یہ الماری بنی ہوئی تھی جس میں بستر کی چادریں اور کمبل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی سی خالی جگہ پر وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ اس کی خوب صورت سیاہ آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ یکایک کوئی چیز اڑتی ہوئی الماری سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتی ہوئی اس کے پاؤں کے پاس گری۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے پاؤں پیچھے کیے اور سہمی سہمی نظروں سے نیچے گرنے والی چیز کو دیکھا۔ یہ اسٹیل کی وہ پلیٹ تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے لاؤنج میں سینٹر ٹیبل پر رکھی تھی۔ اماں صوفے پر بیٹھی آلو کاٹ رہی تھیں اور آلوؤں کے چھلکے اس میں ڈال رہی تھیں۔ وہ پاس بیٹھی انہیں آلو کاٹتے دیکھ رہی تھی کیونکہ اماں اس کی فرمائش پر ہی آلو کاٹ رہی تھیں۔ فرنچ فرائز اسے پسند تھے۔ اس نے کبھی ضد نہیں کی تھی۔ اسے ضد کرنا نہیں آتا تھا۔ آج پتا نہیں کیوں وہ اماں سے کہہ بیٹھی کہ وہ فرنچ فرائز کھائے گی اور اماں جو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں انہوں نے وہیں اس سے آلو منگوا لیے اور آلو کاٹتے ہوئے وہ اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس کے اسکول کی باتیں، اس کی سہیلیوں کی باتیں اور وہ خوش خوش ان سے باتیں کر رہی تھی اور انہیں آلو کاٹتے دیکھ رہی تھی کہ ابا آ گئے۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی تھی۔ اسے ابا سے بہت ڈر لگتا تھا حالانکہ وہ کوئی بدصورت اور بدشکل آدمی نہیں تھے بلکہ بہت وجیہہ، بہت خوب صورت اور بہت پڑھے لکھے تھے۔ کئی بار جب وہ اپنے آپ میں مگن کچھ پڑھ رہے ہوتے تھے تو وہ چپکے چپکے انہیں دیکھا کرتی تھی اور سوچتی تھی ابا کتنے خوب صورت ہیں بالکل شہزادوں جیسے ---- اور انہوں نے کبھی اسے ڈانٹا بھی نہیں تھا پھر بھی وہ ان سے ڈرتی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی۔ ابا نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر اس پر اور اماں پر ڈالی اور پھر دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگے۔

اماں نے اسے کٹے ہوئے آلوؤں والا باؤل دیا۔

"گڑیا یہ کچن میں نازو کو دے دو وہ تمہیں فرائی کر دے گی۔" وہ باؤل نازو کو دے کر لاؤنج میں آئی تو ابا دہاڑ رہے تھے۔ اور اماں سہمی ہوئی صوفے پر بیٹھی اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھیں۔ وہ ڈر کر سیڑھیوں

کے نیچے موجود خلا میں چھپ گئی۔ یہاں سے وہ ابا اور اماں کو نہیں دیکھ رہی تھی لیکن ابا کی آواز اسے آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیا بات ہوئی تھی جو ابا کو غصہ آ گیا تھا اور اسے کبھی بھی یہ پتا نہیں چلا تھا کہ ابا کو غصہ کیوں آ جاتا ہے۔

"جاہل عورت ---- ان پڑھ...... گنوار......" ابا دہاڑے تھے۔

اب پتا نہیں جاہل کون تھا ابا جو ڈھیروں ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود اس وقت لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑے پوری آواز سے چلا رہے تھے یا اماں جو صوفے پر ساکت بیٹھی تھیں اور جن کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ پھر کسی چیز کے دھپ سے کارپٹ پر گرنے کی آواز آئی تھی۔ وہ مزید سکڑ گئی۔ ابا جب بھی غصے میں ہوتے یونہی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکا کرتے تھے۔ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے کھڑے وہ تھک گئی تو آہستہ آہستہ نیچے بیٹھتی گئی۔ اس نے دونوں گھٹنے جوڑے ہوئے تھے اور سمٹ کر بیٹھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ابا کی آواز پھر اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

"اب یہاں بیٹھی کیا میرا منہ دیکھ رہی ہو۔ دفع ہو جاؤ احمق عورت...... میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔" اب شاید اماں اٹھ کر لاؤنج سے باہر چلی گئی ہوں گی۔ اس نے گھٹنوں سے اونچے اپنے فراک کو نیچے کھینچتے ہوئے سوچا۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ اماں نے ابا کی بات نہ مانی ہو۔ اس نے چاہا کہ وہ لاؤنج میں جا کر دیکھے کہ اماں جا چکی ہیں یا نہیں...... لیکن اسے لگا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں ہے۔ وہ اب شاید کبھی کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ پتا نہیں کیوں اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔ ایک ہی زاویے میں چھوٹی سی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں سن ہو گئی تھیں۔ وہ اماں کے پاس جانا چاہتی تھی جو لاؤنج سے یقیناً جا چکی تھیں کیونکہ لاؤنج میں خاموشی تھی لیکن وہ اٹھ ہی نہیں سکی اور گھٹنوں پر چہرہ رکھے وہ ہولے ہولے رونے لگی، گھٹ گھٹ کر۔ لاؤنج سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی۔ شاید ابا نے ٹی وی لگا لیا تھا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں ہی تھے۔ اٹھ کر اماں کے پاس جانے کی خواہش خود ہی دم توڑ گئی تھی۔ اس میں ابا کے سامنے سے گزر کر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سمٹی ہوئی بیٹھی روتی رہی اور پھر پتا نہیں کب وہاں روتے روتے سو گئی۔ پھر نازو کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

"بی بی جی...... روحی بھیا...... گڑیا یہاں ہے۔"

وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ نازو کے ہاتھ میں وہی اسٹیل کی پلیٹ تھی۔ غالباً وہ پلیٹ اٹھانے آئی تھی کہ اس کی نظر گڑیا پر پڑی تھی۔ پہلے روحی اور ان کے پیچھے اماں آئی تھیں۔ روحی نے یکدم ہی اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ "گڑیا تم یہاں چھپی بیٹھی ہو اور ہم نے پورا گھر ڈھونڈ ڈالا۔" اس کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔

"گڑیا تم رو رہی ہو۔ کیا ہوا تھا تمہیں۔" روحی اسے گود میں لیے صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور اس کی پیشانی چوم رہا تھا۔ اماں مجرم سی بنی اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کے پاس ہی صوفے پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"ابا...... ابا کدھر ہیں؟" اس نے لاؤنج میں چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔

"گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے اماں کی طرف دیکھا تھا۔ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں، ستا ہوا چہرہ...... وہ شاید بہت روئی تھیں اور ہمیشہ ہی ابا کے چیخنے

چلانے کے بعد وہ بہت روتی تھیں۔ چھپ چھپ کر اپنے کمرے میں۔ کچن میں کام کرتے ہوئے کبھی بھی۔

''اماں......'' اس نے روی کی گود میں بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے تھے اماں تو جیسے منتظر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے یکدم ہی اسے اپنی گود میں لے لیا تھا اور اب دونوں بازوؤں میں بھینچے اسے چوم رہی تھیں۔ اس کے رخساروں کو اس کے ماتھے کو، اس کے سر کو۔ روی سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔ اسے چومتے ہوئے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور پھر یہ آنسو ان کے رخساروں پر لڑھک آئے تھے۔

''اماں نہ روئیں۔'' وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُن کے آنسو پونچھنے لگی۔ اماں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ان پر اپنے لب رکھ دیے۔ اب وہ اس کے ہاتھوں کو چوم رہی تھیں۔

''اماں، گڑیا ڈر کر وہاں چھپی تھی...... کیا ابا......'' روی کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ اماں نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

''آپ ابا کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں۔ کم از کم گڑیا کے سامنے تو وہ...... یہ ابھی بہت چھوٹی ہے صرف پانچ سال کی۔ یہ ہر وقت خوف زدہ رہتی ہے۔'' اماں نے بے بسی سے روی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ آنسو ان کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

''اماں......'' روی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ اُن کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ ''ابا ایسے کیوں ہیں، اماں وہ اس طرح کیوں بی ہیو کرتے ہیں۔ فیصل ہے، سنی ہے، عالم ہے سب کے گھروں میں کتنا سکون ہے۔ فیصل اور سنی کے ابا تو ان کے ساتھ دوستوں کی طرح ہر بات شیئر کرتے ہیں۔'' اماں کیا کہتیں۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ انہیں تو خود پتا نہیں تھا کہ وہ ایسے کیوں ہیں اور کبھی کبھی تو انہیں اپنا قصور بھی پتا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس بات پر چلا رہے ہیں۔ اور تو جب سے اس گھر میں بیاہ کر آئی تھیں یونہی ذرا ذرا سی بات پر انہیں چلاتے برتن پھینکتے اور توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ یونہی آنسو بہاتی رہیں۔

''اماں ...!'' روی نے بے چین ہو کر ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے تب ہی گیٹ کھلنے اور پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی۔

''ابا آگئے ہیں شاید۔'' روی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میں آج ابا سے بات کرتا ہوں۔''

''نہیں۔'' انہوں نے لرز کر اپنے سترہ سالہ بیٹے کو دیکھا۔ جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں لیکن وہ اس عمر میں بھی بے حد سنجیدہ اور ذہین دکھتا تھا۔

''تم کچھ مت کہنا۔'' پھر کسی فساد سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے جلدی سے اپنے رخسار صاف کیے تھے۔

''میں بات کرلوں گی۔'' روی نے ایسی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ بات نہیں کریں گی۔ پھر گڑیا کو ان کی گود سے لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''اس نے اسکول سے آکر کچھ نہیں کھایا تھا۔ فرنچ فرائز مانگ رہی تھی اور......'' ان کی آواز رندھ گئی۔ سیڑھی پر کھڑے کھڑے اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

''نازو کے ساتھ بھجوادیں۔'' اور پھر وہ اسے گود میں اٹھائے اپنے کمرے میں آگیا۔ اوپر تین بیڈ روم تھے۔ ایک اس کا دوسرا اماں اور گڑیا کا اور تیسرا ابا کا۔ لیکن وہ کم ہی اوپر آتے تھے، ان کا مستقل ٹھکانہ گیسٹ روم تھا جو گراؤنڈ فلور پر تھا۔ گڑیا کو بیڈ پر بٹھا کر وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تو ہماری گڑیا کیا کھائے گی؟''

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ فرنچ فرائز کھانے کی خواہش دم توڑ چکی تھی۔

"آئسکریم کھانے چلیں۔"

"نہیں، کہانی سنائیں۔"

"کون سی۔"

"مرچو والی۔"

اسے "مرچو" والی کہانی بہت پسند تھی۔ وہ سب سے چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے لیکن ہر مشکل وقت میں وہی سب کی مدد کرتا ہے۔ اسے کہانیاں سننا اچھا لگتا تھا۔ حالانکہ وہ صرف پانچ سال کی تھی لیکن رومی اسے تب سے کہانیاں سنا رہا تھا جب وہ ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے کسی کہانی کی سمجھ آتی تھی لیکن رومی کی گود میں لیٹ کر اس سے کہانی سننا اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ یونہی کہانی سنتے سنتے سو جاتی تھی۔

نازو فرنچ فرائز لے آئی تھی۔ وہ اسے کہانی سناتے سناتے چپس بھی کھلاتا جا رہا تھا اور وہ اتنے اشتیاق سے مرچو والی کہانی سن رہی تھی جیسے پہلی بار سن رہی ہو۔ مرچو کی عقلمندی پر اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔ کہانی سنتے سنتے وہ ایک بار پھر سو گئی تھی۔ رومی نے اس کو ٹھیک طرح سے بیڈ پر لٹا دیا اور پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ آج ابا سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

سیمل صحن میں کرسی پر بیٹھی کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی صحن میں آئی تھی۔ اندر کمروں میں بے حد گھٹن اور حبس ہو گیا تھا۔ دوپہر میں ذرا سی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے باہر کا موسم اچھا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ وہ عصر کی نماز پڑھ کر چائے بنانے اٹھی لیکن اماں سو رہی تھیں تو اس نے سوچا ان کے جاگنے پر ہی چائے بنائے گی چنانچہ چائے بنانے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ اندر سے میگزین اٹھا لائی اور اب صحن میں کیاریوں کے پاس کرسی بچھائے میگزین پڑھنے میں مگن تھی۔ موتیے کی خوشبو اسے پسند تھی اور موتیے کی بیل پھولوں سے بھری پڑی تھی۔

"سیمل.....سیمل۔" میگزین پڑھتے پڑھتے اس کے کانوں میں آواز آئی تو اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا۔ میراں اماں دیوار سے جھانک رہی تھیں۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ مسکرائیں۔ ان کے سرخ و سپید چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگتی تھی۔ مہربان اور شفیق سی۔

"جی۔" وہ میگزین کرسی پر رکھ کر دیوار کے پاس آئی۔ دیوار کے پاس لوہے کی کرسی پڑی تھی۔ لوہے کی یہ کرسی ان کے اس گھر میں آنے سے پہلے کی تھی جو غالباً رابطے کا ذریعہ تھی جبکہ دوسری طرف چار سیڑھیوں والی ایلومینیم کی چھوٹی سی سیڑھی ہر وقت دیوار سے لگی رہتی تھی۔ یہ دونوں گھر دراصل دو سگے بھائیوں کے تھے خود تو ڈیفنس چلے گئے تھے اور یہ گھر

ادھوری خوشی

شوہر اور بیوی کی لڑائی ہو گئی۔ بیوی روتے ہوئے بولی۔

"میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں ابھی اپنی ماں کے گھر جا رہی ہوں۔"

شوہر نے فوراً چند نوٹ نکال کر اسے تھمائے اور کہا۔ "یہ لو ہوائی جہاز کا کرایہ اور فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

بیوی روتے ہوئے بولی۔ "واپسی کا کرایہ بھی تو دو۔"

سیدہ فرزانہ عرفان، حجرہ شاہ مقیم

کرائے پرورے رکھے تھے۔ لوہے کی کرسی پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے میراں اماں کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا کیسی ہو؟"

"جی بالکل ٹھیک، آپ کیسی ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے، تمہاری اماں کیسی ہیں؟"

"رات کچھ بے چین تھیں لیکن اب سو رہی ہیں۔" وہ افسردہ ہو گئی۔ اماں کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ یونہی افسردہ ہو جاتی تھی۔

"اللہ انہیں صحت و زندگی دے...... یہ میں نے پکوڑے بنائے تھے شیری کے لیے۔" انہوں نے منڈیر پر رکھی پلیٹ اس کی طرف کھسکائی۔

"ذرا سی بارش ہو تو پکوڑوں کی فرمائشیں کرنے لگتا ہے۔" شیری غالباً نوشیرواں کا نک نیم ہوگا۔ اس نے سوچا اور پلیٹ اٹھالی۔

"شکریہ... اماں جان۔"

"ارے۔" وہ ہنسیں...... "یہ کیا غیروں کی طرح شکریہ ادا کر رہی ہو۔"

"اماں جان...... اماں جان۔" اندر کسی کمرے سے نوشیرواں کی آواز آئی تھی۔ میراں اماں سیڑھی سے اتر گئیں۔

"اب چائے کی طلب ہو رہی ہوگی۔" وہ پھر ہولے سے ہنسی اور پلیٹ اٹھا کر کرسی سے اترتے ہوئے اس نے نوشیرواں کو کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا دراز قد بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔ پتا نہیں اس کا قد کتنا ہوگا...... مروان کے قد سے بڑا ہی ہوگا کچھ...... مروان کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا اور نوشیرواں عادل یقیناً چھ فٹ سے بھی زیادہ ہوگا۔

پلیٹ اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ نوشیرواں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ پلیٹ کاؤنٹر پر رکھ کر اس نے ایک گرما گرم پکوڑا منہ میں ڈالا اور چائے کا پانی رکھ کر وہ اماں کے کمرے میں آئی۔ وہ ابھی تک سو رہی تھیں۔ لائٹ چلی گئی تھی۔ پنکھا بند تھا اور کمرے میں بے حد حبس تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھول کر وہ اماں کے بیڈ کے قریب آئی۔ ان کا پورا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا کچھ بال پیشانی پر چپکے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کے چہرے سے پسینہ پونچھا۔ ماتھے پر آئے بال پیچھے کیے تو انہوں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں اور سیمل کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی اجنبیت اور بیگانگی تھی جو پچھلے کئی سالوں سے وہ دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ہمیشہ کی طرح دکھی ہو گیا۔ "وہ دن کب آئے گا میری زندگی میں جب اماں مجھے اسی شفقت و محبت سے دیکھیں گی جیسے پہلے دیکھا کرتی تھیں۔ جب ان کی آنکھوں میں میرے لیے پہچان کے رنگ ہوں گے جب وہ محبت سے مجھے بلائیں گی۔"

"اماں جی باہر چل کر بیٹھیں۔ باہر موسم اچھا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بارش ہوئی تھی نا...... میراں اماں نے پکوڑے بھیجے ہیں اور میں نے چائے کا پانی رکھ دیا ہے۔ باہر ہی چائے پیتے ہیں۔"

انہوں نے حسب معمول کچھ نہیں کہا تھا اور یونہی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی انہوں نے کچھ نہیں کہنا۔ وہ بھی کچھ نہیں کہتی تھیں بس ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھیں لیکن پھر بھی جب وہ ان کے پاس بیٹھتی تو ہر بات ان سے کرتی...... بھلے وہ سنتی سمجھتی ہوں یا نہیں سیمل کو تو ہر بات ان سے شیئر کرنا ہوتی تھی۔ کیا پتا اماں کسی روز اس کی کسی بات پر چونک جائیں... کبھی کوئی لفظ ان کی زبان سے نکلے۔ اس نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔ بیڈ کے پاس ان کے چپل رکھے اور جھک کر ان کے پاؤں میں پہنائے۔ تکیے کے پاس پڑا دوپٹا انہیں اوڑھایا۔

"چلیں اماں۔" وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں لے کر باہر آئی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ برآمدے میں بچھے تخت پر انہیں بٹھا کر وہ تیزی سے صحن کی طرف لپکی۔ کرسی پر اوندھا پڑا تکیہ یونہی تھوڑا بھیگ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے تکیہ اٹھا کر دوپٹے سے پونچھا پھر کرسی اٹھا کر برآمدے میں رکھی اور تخت پر پڑا گول تکیہ اٹھا کر اماں کے پیچھے رکھا۔

"اماں آرام سے بیٹھ جائیں ٹیک لگا کر، میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔" اماں اب ادھر ادھر کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ تین سال پہلے ان میں یہ تبدیلی آئی تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ کسے کھوجتی ہیں لیکن وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ہر بار کی طرح اس نے آج بھی ان سے پوچھا تھا۔ "اماں جی آپ کسے کھوجتی ہیں، کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟" وہ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مروان کو نا...... مروان نہیں ہے اماں...... نہیں۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے اس کا دل کٹ کر گر جائے گا۔ اماں کی ساکت نظروں سے گھبرا کر وہ جلدی سے کچن میں چلی گئی۔ کبھی کبھی اماں کی ان ساکت نظروں سے بہت خوف آتا تھا۔ "میں ایسا کیا کروں کہ اماں ہوش و حواس کی طرف لوٹ آئیں۔" اس نے آنکھوں میں آجانے والے آنسو پونچھے اور چائے بنانے لگی۔ چائے بنا کر اس نے ٹرے میں رکھی اور پھر پکوڑوں کی پلیٹ اٹھائی۔ پکوڑے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اس کی نظریں مائیکرو کی طرف اٹھیں لیکن پھر مایوس ہو کر اس نے ٹھنڈے پکوڑے ہی پلیٹ میں رکھے اور کچن سے نکل آئی۔

اماں سامنے کیاریوں کے پاس پھدکتی ہوئی چڑیا کو دیکھ رہی تھیں جو اپنی چونچ سے کیاری کے پاس جمع ہونے والے پانی کے چھینٹے اڑا رہی تھی۔ اس نے ٹرے تخت پر رکھی اور اماں کی نظروں کے تعاقب میں

پانی کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی چڑیا کو دیکھا اور پھر کپ اٹھا کر اماں کو دیا۔

"اماں چائے لے لیں۔" انہوں نے چائے پکڑی تو سیمل نے پکوڑوں کی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔

"اماں لیں نا...... بہت مزے کے بنے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈے ہو چکے ہیں پھر بھی اچھے لگ رہے ہیں۔" اماں نے پکوڑا اٹھالیا تھا۔

"میری اماں ہیں نا، یہ انہوں نے بنائے ہیں۔ یہ ادھر ساتھ والے گھر میں رہتی ہیں۔ یہ لوگ کچھ عرصے پہلے ہی آئے ہیں لیکن میراں اماں بہت اچھی ہیں بالکل آپ جیسی...... پتا ہے ان کا بیٹا ہے نا وہ نوشیرواں عادل۔ پتا نہیں اصل والا نوشیرواں عادل کیسا ہوگا لیکن یہ تو خوب لمبا تڑنگا ہے اور شکل سے فوجی لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ کوئی فوجی ہے...... ہو سکتا ہے نہ ہو، کچھ لوگ تو ویسے بھی فوجی کٹ بالوں کو پسند کرتے ہیں۔" وہ چائے پیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اُن سے باتیں کیے جا رہی تھی۔

"اور یہ جو نوشیرواں ہے نا اماں یہ بھی اپنی اماں جان کی طرح ہے۔ مہربان اور ہمدرد۔ پتا ہے اس روز میں اسٹاپ پر اکیلی تھی تو وہ صرف میرے لیے دھوپ میں کھڑا رہا اور جب میری وین آگئی تب گیا۔ اس روز حنہ نے کی چھٹی کی تھی اور پوائنٹ بھی نکل گیا تھا۔ وہاں اکیلے مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ وہاں سے گزرا تو پتا نہیں کیسے اس نے مجھے پہچان لیا ورنہ میں تو اسے بھی دیکھ کر ڈر گئی تھی۔" اس نے خالی کپ ٹرے میں رکھ کر اُن کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں کپ تھا اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ پتا نہیں انہیں کیا یاد آیا تھا۔ وہ ماضی کا کون سا منظر دیکھ رہی تھیں حالانکہ ان کی زندگی میں خوش کن منظر تو تھے ہی نہیں یا بہت کم لیکن وہ بھی اداسی میں لپٹے ہوئے۔

"اماں۔" اس نے بہت ہولے سے اُن کا ہاتھ چھوا۔ "کیا سوچ رہی ہیں؟" انہوں نے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔ لبوں پہ بکھری مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور انہوں نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا اور چند گھونٹوں میں ٹھنڈی چائے حلق سے نیچے اتار لی۔

یسل کو پچھتاوے نے گھیر لیا۔ اماں اس طرح تو کبھی ہفتوں مہینوں بعد مسکراتی تھیں اور اس نے انہیں ٹوک دیا۔ کچھ دیر تو وہ یونہی پچھتاوے میں گھری اماں کو محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی پھر ان کے پاس ہی تخت پہ بیٹھ کر رسالہ پڑھنے لگی۔ اماں کی نظریں پھر ادھر اُدھر کسی کو کھوج رہی تھیں لیکن اب اس کا دھیان کہانی کی طرف تھا۔ کہانی ہمیشہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتی تھی اور وہ اس میں کھو کر ارد گرد سے بے نیاز ہو جاتی تھی۔ کہانیاں پڑھنے کا چسکا اسے مروان نے لگایا تھا۔ وہ اس کے لیے ڈھیروں کتابیں خرید کر لاتا تھا اور کبھی جب ان کے پاس پیسوں کی کمی ہوتی تھی تو وہ دونوں انار کلی اور اردو بازاروں میں پرانی کتابیں کھوجتے پھرتے تھے۔ کتنی ہی شاندار کتابیں انہوں نے فٹ پاتھ پہ بیٹھے حامو چاچا سے خریدی تھیں۔

حامو چاچا چھ دن گلی گلی پھر کر پرانی کتابیں خریدتا پھر ان میں سے اچھی اور پڑھنے کے قابل کتابیں چھانٹ کر الگ کرتا۔ پھٹی پرانی اور بیکار کتابیں ردی میں فروخت ہو جاتیں۔ ہر اتوار کو کتابیں سجا کر فروخت کرتا تھا۔ مروان اور یسل کو تو وہ اتنا جاننے لگا تھا کہ کئی بار وہ کوئی اچھی کتاب ان کے لیے الگ سے رکھ دیتا۔ تب مروان اس کا بے حد ممنون ہوتا۔

"چاچا آپ نے ہم غریبوں کا خیال کیا ورنہ یہ اتنی قیمتی کتاب ہم کبھی بھی نئی نہیں خرید پاتے۔۔۔" اور حامو چاچا مسکرا دیتا۔ وہ بہت زیادہ گفتگو نہیں کرتا تھا نہ ہی کوئی مول تول۔ اچھی حالت والی کتابیں ہاف قیمت پر مل جاتی تھیں اور ذرا کم بہتر ایک چوتھائی قیمت پر۔

اب کتنے دن ہو گئے تھے کہ وہ اتوار کو انار کلی نہیں گئی تھی بلکہ دن کہاں سال ہی گزر گئے تھے شاید آخری بار وہ تقریباً چھ سال پہلے مروان کے ساتھ گئی تھی۔ جب مروان سیاچن سے آیا تھا، اس کی پوسٹنگ وہاں ہو گئی تھی اور وہ ہفتہ بھر رہنے کے لیے آیا تھا اس ایک ہفتے میں اس نے کتنا انجوائے کیا تھا۔ مروان نے اسے ڈھیروں کتابیں خرید کر دی تھیں۔ فیروز سنز سے واپسی پر وہ انار کلی ہی گئے تھے حامو چاچا نے ان کے لیے دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کتابیں لے کر اس روز مروان نے ان سے بہت ساری باتیں کی تھیں اور اس روز پہلی بار حامو چاچا نے بتایا تھا کہ ان کا ایک بیٹا ہے ایم اے پاس لیکن نوکری نہیں ملتی۔

"اس نے ڈھونڈی نہیں ہو گی آپ جو اس عمر میں کما رہے ہیں۔" اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا تب اس پر ایک سرزنش بھری نظر ڈال کر مروان اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ حامو چاچا ہمیشہ صاف ستھرے دھلے ہوئے لباس میں ہوتا۔ اس کے سر پہ صاف ستھری پگڑی بندھی ہوتی اور آنکھوں میں سرمہ لگا ہوتا۔ ایک بار اس نے مروان سے کہا تھا۔

"مجھے حامو چاچا اشفاق احمد کا کوئی بابا لگتا ہے کیا آپ کو بھی ایسا لگتا ہے؟" تب مروان بہت ہنسا تھا۔

"ہر وقت کتابوں کی دنیا میں نہ رہا کرو۔ کوئی بابا وابا نہیں ہے بس رزقِ حلال کمانے والا اللہ کا بندہ ہے۔"

"اور رزقِ حلال کمانے والے اللہ کے بندے ہی تو اللہ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں۔" یہ اس کا خیال تھا اور اس کے دل میں حامو چاچا کے لیے بڑی عقیدت تھی اس نے سوچا تھا کہ کبھی وہ ضرور اکیلی جا کر حامو چاچا سے کچھ ایسی باتیں ضرور کرے گی کہ اشفاق احمد کی طرح اسے کھوج سکے کہ وہ تصوف کے کس مقام پر ہے۔

لیکن مروان نہیں تھا تو وہ اکیلی کیسے جاتی۔ وہ تو کبھی کہیں اکیلی گئی ہی نہیں۔ "مروان آجائے تو پھر ہی جاؤں گی۔" اس نے بے خیالی میں سوچا اور ہاتھ پلیٹ کی طرف بڑھایا لیکن پلیٹ خالی ہو چکی تھی۔ کہانی پڑھتے پڑھتے اسے پتا ہی نہیں چلا اور اس نے سارے پکوڑے ختم کر دیے تھے۔

اس نے پلیٹ کی طرف دیکھا اور پھر اماں کی طرف، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں اس کے ہاتھ میں پکڑے میگزین پر تھیں۔ بوندا باندی اب رک چکی ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کو تھا اور اماں کی نظریں رسالے پر تھیں۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ سمجھ گئی تھی کہ اماں چاہتی ہیں وہ پڑھنا چھوڑ دے۔ انہوں نے ہمیشہ ہی اسے مغرب کے وقت پڑھنے سے منع کیا تھا۔ کبھی جو وہ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ مغرب کے وقت دیکھتیں تو فوراً ٹوکتی تھیں۔

"یسی بیٹا بند کرو پڑھنا۔ دونوں وقت مل رہے ہوتے ہیں ایسے میں تو بہتے دریا بھی رک جاتے ہیں۔" اور اس نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ دور کہیں کسی مسجد میں اذان شروع ہوئی تھی اور اماں مضطرب سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اب وہ پڑھ نہیں رہی تھی صرف ورق گردانی کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اماں اسے زبان سے منع کریں۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے اسے اماں کی آواز سنے۔ حالانکہ وہ ان کی ہر بات بن کہے ہی سمجھ جاتی تھی لیکن کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ اماں بولیں تو وہ یونہی انجان بن جاتی تھی۔ بے کلی سے پہلو بدلتے ہوئے انہوں نے اس کے ہاتھ سے رسالہ پکڑ لیا تھا۔

"کیا ہے اماں پڑھنے دیں نا!" اس نے مصنوعی جھنجلاہٹ سے کہا اور رسالہ ان کے ہاتھ سے لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ انہوں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"نہیں۔۔۔ مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔" اس کا جی چاہا وہ خوشی سے ناچنے لگے۔ کتنے دنوں بعد اماں نے یوں پورا ایک جملہ بولا تھا۔ اس کے کانوں میں جیسے اب بھی ان کی آواز گونج رہی تھی۔ بے اختیار اس نے ان کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے ان کی پیشانی چوم لی۔

"سو سویٹ مام، میں وضو کرنے جا رہی ہوں، آپ نماز پڑھیں گی؟"

"میں۔" ان کے لب ہلے تھے اور انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔ "میں کیسے پڑھوں؟" انہوں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"جیسے میں پڑھوں گی، میں بتاؤں گی آپ کو۔۔۔ آئیں میں آپ کو وضو کے لیے لے جاؤں۔" وہ تخت سے اتری اور پاؤں میں چپل پہن کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر پہلی کیفیت میں ساکت سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھیں۔ یہاں وہاں کچھ دیر پہلے چڑیا پھدک رہی تھی لیکن اب وہ جگہ خالی تھی۔ اس نے چڑیا کی تلاش میں نظر دوڑائی وہ اب جامن کے درخت پر بیٹھی تھی۔ ان کے چہرے پر خوف تھا اور کبھی کبھی وہ یوں ہی خوف زدہ ہو جاتی تھیں۔

"اور یہ اچھی بات ہے اماں کا اس طرح ری ایکٹ کرنا، کل ڈاکٹر عرفان کو بتاؤں گی اور مروان کو بھی۔ کتنا خوش ہو گا مروان جب اسے پتا چلے گا کہ آج اماں نے مجھ سے بات کی مجھے ٹوکا۔۔۔۔۔۔ رسالہ

پڑھنے سے منع کیا۔" وہ خوشی خوشی سوچتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

روی ان کے سامنے بیٹھا تھا اور انہیں بغور دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ ٹی وی سے نظریں ہٹا کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ان جیسا تھا شاید جب وہ اس کی عمر کے ہوں گے تو وہ بھی ایسے ہی ہوں گے دبلے پتلے اسمارٹ...... ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ شکر ہے اس عورت نے اپنے جیسے بچے پیدا نہیں کیے ورنہ۔

"کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی۔" روی نے اضطراب سے انگلیاں مروڑیں۔ "ابا جی مجھے یہ کہنا تھا کہ گڑیا اب بڑی ہو رہی ہے، وہ آپ دونوں کی لڑائی سے بہت ڈسٹرب ہوتی ہے، ڈر جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں نا وہ بہت حساس ہے۔ آج بھی......" وہ انہیں تفصیل بتانے لگا۔ "یعنی دو گھنٹے تک وہ وہاں سیڑھیوں کے نیچے خوف زدہ ہو کر چھپی رہی اور اس جاہل عورت کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔" وہ یکدم ہی لال سرخ ہو کر دہاڑے تھے۔ "کل کلاں کو کوئی اسے اٹھا کرلے جائے تو اس احمق، بے وقوف عورت کو پتا ہی نہیں چلے گا۔"

"ابا جی پلیز......" روی نے پریشان ہو کر التجا کی۔ "وہ آپ اس کے اس طرح چیخنے چلانے سے ڈر جاتی ہے۔ آپ کو اگر کوئی بات اماں سے کرنی ہے تو آہستہ آواز میں بھی کر سکتے ہیں، جو بھی آپ کے اختلافات ہیں ان سے پلیز انہیں ختم کرلیں۔ میرے لیے گڑیا کے لیے۔"

"اختلافات۔" ان کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری۔ "مجھے بھلا اس عورت سے کیا اختلافات ہو سکتے ہیں۔" روی نے اپنے دل میں بے حد تکلیف محسوس کی۔ ابا نے کبھی اماں کو ان کا نام لے کر نہیں بلایا تھا بلکہ وہ ہمیشہ انہیں عورت کہہ کر بلاتے تھے۔

"اختلافات تو برابر کے لوگوں میں ہوتے ہیں اور وہ عورت میرے برابر ہو سکتی ہے۔" روی کو لگا جیسے ان کی گردن اکڑ گئی ہو، انہوں نے بڑے فخر سے روی کو دیکھا۔

"کیا وہ عورت اس قابل تھی کہ میری بیوی بنتی۔ چوہدری حبیب خان کی، بتاؤ؟" روی کا دل جیسے پھٹ جانے کو ہوا۔ بھلا اماں میں کیا کمی تھی۔ ان کے سانولے رنگ میں کتنی ملاحت تھی۔ ان کا دلکش سراپا، ان کے خوب صورت تیکھے نقوش اور ان کی ہرنی ایسی آنکھیں جن میں ہر وقت ایک ہراس چھایا رہتا گڑیا کی آنکھیں بالکل ان جیسی تھیں۔

"چپ کیوں ہو گئے ہو، بتاؤ نا ہے وہ عورت اس قابل؟" روی نے دکھ سے انہیں دیکھا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ اس شخص نے آکسفورڈ اور ایڈنبرا سے تعلیم حاصل کی ہے۔"

"وہ عورت میرے قابل نہیں ہے۔ جاہل، بے وقوف عورت......" اسے خاموش دیکھ کر وہ بڑبڑائے تھے۔

"یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا شادی سے پہلے، آپ پر جبر تو نہیں کیا گیا ہوگا۔" بے اختیاری اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"براہ راست جبر نہیں تھا میاں لیکن بالواسطہ جبر ہی تھا۔ میں نے اپنی ماں کو خود اپنے لیے دلہن کے چناؤ کا اختیار دیا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے لیے ایسی لڑکی پسند کریں گی جسے ساتھ لے کر چلتے ہوئے مجھے شرم آئے گی۔ ان پڑھ جاہل۔"

"اماں دس جماعت پاس تھیں اور شاید دادی کے نزدیک ان کی اتنی تعلیم کافی تھی۔" روی نے تاسف سے انہیں دیکھا اور بے حد تحمل سے بولا۔

"اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ گھر کو کیوں جہنم بنا رکھا ہے آپ نے۔ انہیں اس قصور کی سزا کیوں دے رہے ہیں جو انہوں نے نہیں کیا۔"

"میں نے۔" انہوں نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے گھر کو جہنم بنا رکھا ہے یا اس عورت نے۔ جسے نہ پہننے کا سلیقہ ہے نہ اوڑھنے کا نہ اس بڑے گھر میں رہنے کا۔ کبھی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بھنڈیاں کاٹ رہی ہوتی ہے تو کبھی آلو اور کبھی......"

"ابا جی پلیز......" روی نے ایک بار پھر التجا کی۔ "آپ اماں سے عزت سے بات کیا کریں۔ ملازم بھی سنتے ہیں اور ہم...... میں اور گڑیا بھی بہت ڈسٹرب ہو جاتے ہیں۔"

"کس کی جرات ہے جو مجھ پر ہنسے۔" انہوں نے غصے سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا۔ "اور تم...... اب وہ اسے گھور رہے تھے۔ "میں جانتا ہوں تم کس کے کہنے پر یوں میرے سامنے کھڑے مجھ سے باتیں کر رہے ہو...... جوان ہو گئے ہو تم، کالج میں آ گئے ہو تو میرے باپ بن گئے ہو۔ فرسٹ ایئر فول...... وہ کھڑے ہو گئے۔

"اور اس سے تو میں پوچھتا ہوں ابھی...... اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ میری اولاد کو میرے خلاف کرتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہے ابا جی۔ اماں نے تو کچھ نہیں کہا میں تو گڑیا کی وجہ سے خود ہی......" روی نے دوڑ کر ان کا ہاتھ پکڑا لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر تیزی سے باہر نکل گئے۔ روی ان کے پیچھے بھاگا لیکن انہوں نے گیسٹ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا جہاں اماں ان کے بیڈ کی چادر تبدیل کر رہی تھیں اور اب ایک نیا محاذ کھل گیا تھا۔ اندر سے ان کے چیخنے چلانے اور چیزیں پھینکے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ روی ننگے پاؤں پریشان سا کھڑا بے بسی سے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی شاید اپنی ماں کی طرح بے بس تھا۔ وہ اس شخص جو اس کا باپ بھی تھا کی باتوں سے اپنی ماں کو نہیں بچا سکتا تھا۔ ان باتوں سے جو نہ صرف اس کی ماں کی بلکہ اس کی عزت نفس کو بھی مجروح کرتی تھیں۔ وہ بے بسی سے پلٹا۔ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے نازو کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ چڑاتی ہوئی غصہ دلاتی ہوئی۔

"شٹ......" اس نے غصیلی نظر نازو پر ڈالی اور تقریباً دوڑتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں سے ہوتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا اور اپنے بیڈ روم میں بیڈ پر اوندھا گر کر رونے لگا۔ وہ سترہ سال کا بھیگتی مسوں والا لڑکا آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد اس کے آنسو آپ ہی آپ تھم گئے تھے لیکن وہ یونہی لیٹا رہا...... پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی۔ وہ یونہی چپ چاپ لیٹا سوچتا رہا کہ وہ کسی قابل ہوا تو وہ اماں اور گڑیا کو لے کر نکل جائے گا۔ بلا سے کوئی چھوٹا سا گھر ہوگا لیکن وہاں سکون تو ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں عہد کرتا رہا اور پلان بناتا رہا جب کمرے میں سوئچ آن کرنے کی آواز آئی۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ سوئچ بورڈ کے پاس اماں کھڑی تھیں۔

"اماں جی۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا روی......" انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر اس کی بھیگی پلکوں کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔

"تم روئے ہو روی...... تم تو کبھی نہیں روتے تھے۔" وہ ایسا ہی تو تھا، کتنی ہی سخت چوٹ لگتی وہ ذرا نہیں روتا تھا۔ اس لیے کہ اسے فوجی بننا تھا اور فوجی تو بہادر

ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں روتے۔ یہ دادا جان نے اس سے کہا تھا جب وہ گاؤں میں چھت سے گر گیا تھا اور اس کے سر پر بہت گہرا زخم آیا تھا۔ پھر وہ اسٹیچز لگتے ہوئے بھی نہیں رویا تھا۔

لیکن فوجی بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی تو ہوتے ہیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا اور کبھی کبھی ایسے زاویے سے چوٹ لگتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں لیکن وہ کوئی چوٹ لگنے پر تو نہیں رویا تھا بلکہ اپنی بے بسی پر رو یا تھا۔ یکا یک اس کی نگاہ اماں کے رخسار پر پڑی تھی۔ پانچوں انگلیوں کے نشان اس پر ثبت تھے۔

"انہوں نے آپ کو مارا ہے؟" یکدم ان کے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھڑا کر اس نے ان کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا۔ اماں نے نگاہیں جھکالیں جیسے یہ بھی ان کا جرم تھا۔

"اماں...... یہ...... یہ میری وجہ سے ہوا۔" وہ ان سے لپٹ کر بلک پڑا۔ وہ ہولے ہولے اسے تھپک رہی تھیں اور وہ ان سے لپٹا رو رہا تھا۔

"بس کر روحی مت رو...... میرا دل پھٹ جائے گا بیٹا...... تیری بہن جاگ جائے گی۔" ہولے ہولے وہ سنبھل گیا۔ اماں اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

"اماں جی......" وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا اور اپنے ہاتھ اُن کے رخسار پر پھیر رہا تھا۔

"یہ ابا ایسے کیوں کرتے ہیں؟" کتنی بار کا پوچھا ہوا سوال اس نے پھر پوچھا تھا۔

"پتا نہیں بیٹا...... میں تو خود بھی سمجھ نہیں پائی کہ وہ ایسے کیوں ہیں۔ کتنی کوشش کرتی ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو انہیں غصہ دلائے لیکن پھر بھی...... مجھے معاف کردو بیٹا۔"

"اماں جی......" وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ "آپ ایسا کہہ کر مجھے گناہ گار کررہی ہیں۔ انہیں غصہ دلانے کے لیے کسی بات کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو ہمہ وقت ہی غصے میں رہتے ہیں۔" اور بات کرتے کرتے اس کی نظر گڑیا پر پڑی جو اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ارے میری گڑیا جاگ گئی۔" روحی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اماں پر تھیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے اماں کی طرف کھسکی تھی۔

"اماں درد ہورہا ہے؟" اس نے ہاتھ سے رخسار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ روحی اور اماں کی آنکھوں میں بیک وقت حیرت اتری تھی۔

"نہ...... نہیں تو بیٹا۔" وہ مسکرائی تھیں لیکن گڑیا کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

"اماں بہت درد ہورہا ہے آپ کو مجھے پتا ہے۔" پھر وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری اور بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز کھینچ کر پونستان کا پتا نکالا۔

"یہ کھالیں درد ٹھیک ہوجائے گا۔ ہیں نا روحی بھائی۔" روحی مسکرایا تھا۔

"اماں جی ہماری گڑیا بہت عقلمند ہے۔"

"لیکن بیٹا یہ دوائیاں اس طرح نہیں رکھا کرو، بچی ہے کسی دن کھانہ بیٹھے۔"

"جی آئندہ احتیاط کروں گا۔" روحی نے گڑیا کے ہاتھ سے ٹیبلیٹ لے کر اماں کو دیں۔

"بیٹا تمہارے لیے کھانا لے آؤں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"نہیں، نہیں اماں جی۔" اماں کی تکلیف کے خیال سے روحی تڑپ اٹھا۔ "ہم خود لے آکر کھالیں گے آپ تکلیف نہیں کریں...... ابا کھا چکے......؟"

"ہاں، وہ سونے کے لیے چلے گئے ہیں۔" اور ان کے پیچھے پیچھے گڑیا کی انگلی تھامے چلتے ہوئے وہ دل ہی دل میں خود سے عہد کررہا تھا کہ پہلی اور آخری بار تھی جو اس نے ابا سے بات کی تھی۔ اب اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ کیا کوئی بھی ایسا نہیں جو ابا کو سمجھا سکے۔ نرمی سے، سختی سے۔ اس گھر میں کوئی بزرگ بھی تو نہیں ہے۔ دادا جان، دادی جان کوئی تو ہوتا جس کا لحاظ وہ کرتے۔ اس نے ہوش اسی گھر میں سنبھالا تھا اور اپنی ساری زندگی میں اس نے دادا جان یا دادی جان کو یہاں آتے کم ہی دیکھا تھا۔ بس دو یا تین بار ہی وہ آئے ہوں گے۔ گڑیا کی پیدائش پر، اس کے اور گڑیا کے عقیقے پر یا پھر ایک بار جب دادی جان بیمار تھیں اور یہاں اسپتال میں رہی تھیں۔ اماں، دادی جان کے پاس اسپتال میں رہتی تھیں اور وہ دادا جان کے ساتھ شام کو انہیں ملنے اسپتال جاتا تھا۔ دادا جان کتنے مزے کی باتیں کرتے تھے، وہ ان کے ساتھ بہت خوش تھا۔ پھر دادی جان ٹھیک ہوکر گاؤں چلی گئیں اور پھر اس کے بعد وہ کبھی یہاں نہیں آئی تھیں نہ ہی دادا جان۔ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ یہاں ان کے پاس رہیں۔ جب بھی ان کا فون آتا وہ انہیں اپنے ہاں آکے رہنے کی دعوت ضرور دیتا تھا اور وہ ہنس کر ٹال دیتے۔

ان دنوں وہ عید پر گاؤں جایا کرتے تھے اور یہ دن بھی اس کے لیے یادگار دن ہوتے تھے۔ وہ دادا جان کے ساتھ پورے گاؤں میں گھومتا، پھرتا کھیتوں میں جاتا۔ گنے توڑ کر کھاتا...... مکئی کے بھٹے ماسی پاجاں سے آگ پر بھنوا کر ان پر لیموں اور نمک مرچ چھڑک کر کھاتا۔ یہ سب اسے بہت فینسی نیٹ کرتا تھا پھر دادی جان فوت ہوگئیں۔ وہ بہت رویا تھا۔ اسے یاد تھا جب وہ لوگ واپس آرہے تھے تو اماں نے ابا سے التجا کی تھی۔

"ابا اب اکیلے رہ گئے ہیں۔ ہم انہیں ساتھ نہ لے جائیں۔"

"ہم نے کوئی عمر بھر کی خدمتوں کا ٹھیکا نہیں لے رکھا احمق عورت، کبھی تو عقل کی بات کیا کرو۔" ان کا وہی طرز تخاطب تھا۔

"اولاد آخر کس دن کے لیے ہوتی ہے جی؟"

"ہوں، اولاد......" انہوں نے کتنی نفرت سے کہا تھا۔ اور دادا ابا کی انگلی پکڑے اندر آتے ہوئے اس نے دادا ابا کی طرف دیکھا تھا جن کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ اندر جانے کے بجائے وہاں سے واپس مڑ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ صرف ایک بار گاؤں گئے تھے دادی جان کی برسی پر تین سال پہلے...... تب گڑیا صرف دو سال کی تھی۔

تین سال ہوگئے تھے اس نے دادا جان کو نہیں دیکھا تھا اور تین سال سے وہ گاؤں نہیں گئے تھے۔ اماں نے ایک دو بار کہا بھی تھا تو ابا نے منع کردیا تھا۔

"تمہیں بہت شوق ہے دھول مٹی کھانے کا تو چلی جاؤ۔ میں بھی دو چار روز سکھ سے رہ لوں گا لیکن میرے بچوں کو مت لے کر جانا وہاں۔" اور اماں نے تو کبھی اپنی مرضی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ابا کی مرضی پر سر جھکا دیتی تھیں لیکن وہ تو اپنی مرضی کرسکتا تھا...... اس نے آخری نوالہ منہ میں ڈال کر پلیٹ کھسکا دی۔

"ارے بیٹا بس یہ فرائی چکن لے لو نا تمہیں تو بہت پسند ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی پلیٹ خالی تھی اور وہ گڑیا کو قصے بنا بنا کر کھلا رہی تھیں۔ اپنے ہی دھیان اور سوچوں میں گم اس نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ اماں نے اپنی پلیٹ میں کچھ ڈالا ہی نہیں تھا۔

"اماں جی......" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آبیٹھا پھر اپنے ہاتھوں سے ان کی پلیٹ میں چکن ڈالا۔

"ارے ارے بیٹا، مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"بھوک نہیں ہے تو پھر بھی تھوڑا سا کھالیں۔" اس نے نوالہ بنایا۔ "منہ کھولیں۔"

"روی!" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور ان کے رخساروں پر بہنے لگے۔

"اماں جی نہ روئیں...... نہیں تو گڑیا بھی روئے گی۔" گڑیا نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے۔

"میں نہیں روتی چندا...... جس ماں کا روی جیسا بیٹا اور گڑیا جیسی بیٹی ہو وہ بھلا کیوں روئے گی میری جان۔" انہوں نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا لیکن آنسو تھے کہ بہے چلے آرہے تھے اور روی ایک بار پھر عہد کر رہا تھا کہ وہ اماں کو ایک روز ضرور ایسی زندگی دے گا جس میں آنسو نہیں ہوں گے صرف مسکراہٹیں ہوں گی۔

اگلے روز وہ کالج جانے کے بجائے سیدھا دادای بابا کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اکیلا گاؤں نہیں گیا تھا۔ ہمیشہ ابا اماں کے ساتھ گاڑی پر جاتا تھا۔ آج پہلی بار وہ اکیلا گاؤں جا رہا تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے گاؤں میں کون سی بس جاتی ہے اور کہاں سے جاتی ہے۔ دو چار لوگوں سے پوچھنے کے بعد وہ بالآخر مطلوبہ بس تک پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے اس کے گاؤں کا رستہ صرف گھنٹے بھر کا تھا۔ اس نے صبح کالج آتے ہوئے اماں کو بتا دیا تھا کہ اسے ایک دوست کے ساتھ کہیں جانا ہے اس لیے دیر ہوجائے گی۔ اسے دادا جان سے ملنا تھا وہی تھے جو ابا کو سمجھا سکتے تھے۔ اور تین سال بعد وہ دادا کے سامنے کھڑا تھا۔ ان تین سالوں میں وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے اور پھر کتنی ہی دیر تک اسے اپنے کمزور بازوؤں میں لیے کھڑے رہے تھے۔

"تمہارے ابا سے کچھ دیر پہلے ہی بات ہوئی تھی لیکن انہوں نے تمہارے آنے کا نہیں بتایا۔" دادا اسے یونہی بازو کے حلقے میں لیے اندر بڑے کمرے میں آئے تھے۔

"میں انہیں بتا کر نہیں آیا۔"

"ارے کیوں......؟" دادا پھر حیران ہوئے تھے۔

"مجھے آپ سے ملنا تھا۔"

"خیریت ہے نا بیٹا؟" وہ پریشان سے ہوگئے تھے۔

"دادا جان آپ میرے ساتھ چلیں، ہمارے ساتھ ہمارے گھر رہیں۔ ہمیں آپ کی سخت ضرورت ہے...... آپ ہوں گے تو شاید ایسا نہ ہو جیسا تماشا ہر روز ہوتا ہے۔"

"کیسا تماشا بچے......؟" دادا جان ابھی تک حیران تھے۔

"آپ نہیں جانتے دادا جان، ابا ہر روز کس بری طرح اماں کی بے عزتی کرتے ہیں۔" وہ بولے ہوئے بتاتا چلا گیا۔ دادا جان نے بڑی خاموشی سے اس کی ساری بات سنی تھی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"میرے جانے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا بیٹا۔ بلکہ شاید وہ مجھے ستانے کے لیے اور زیادہ ری ایکٹ کرے...... میں اس لیے تو وہاں نہیں جاتا۔ نہیں دیکھ پاتا میں مینا کی یہ حالت...... مرتی ہوئی بہن سے وعدہ کیا تھا میں نے کہ مینا کا ہمیشہ خیال رکھوں گا لیکن وعدہ نہیں نبھا پایا۔ اس سے تو اچھا تھا وہ ددھیال میں ہی رہتی اور کسی چاچے تائے کے بیٹے سے اس کی شادی ہوجاتی۔ پر میں نے سوچا تھا کہ میرا حبیب اتنا پڑھا لکھا ہے اتنا بڑا افسر ہے اور اس کے گھر میں آکر کوئی غیر کیوں عیش کرے میری مینا کیوں نہیں۔ پر مجھ سے بڑی بھول ہوئی پتر۔"

"ابا ایسے کیوں ہیں دادا جان؟" اس نے وہی سوال کیا جو وہ اماں سے کیا کرتا تھا۔

"ہماری غلطی ہے بیٹا، ہم نے اسے بہت لاڈ دیا، سر پر چڑھایا، ہر وقت اس کی تعریفیں کر کر کے اسے خود پسند بنا دیا۔ تمہاری دادی تو اس کے گرد پروانے کی طرح چکراتی تھی۔ ہماری اولاد نہیں تھی۔ ہم ترسے ہوئے تھے اولاد کی محبت کے لیے اس لیے جب میں اسے لے کر آیا تو تمہاری دادی تو مانو پاگل ہوگئی تھی۔ میری گود میں تو مانو چاند کا ٹکڑا آگیا ہے۔ وہ ہر ایک سے کہتی پھرتی تھی۔"

"کہاں سے لائے تھے انہیں آپ؟" روی نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک یتیم خانے سے۔ وہ ہماری اولاد نہیں تھی لیکن ہم نے اسے اولاد سے بڑھ کر چاہا...... ہم نے اپنی ساری توانائیاں اور دولت اس کی پرورش پہ خرچ کردی اور اپنی دانست میں اس کے لیے ایسی لڑکی کا انتخاب کیا جو لاکھوں میں ایک تھی لیکن اس نے کہا ہم اس کے سگے ماں باپ نہیں تھے اس لیے ایسی لڑکی ڈھونڈی جو اس کے قابل نہیں تھی۔ اس نے ہماری برسوں کی ریاضت لمحوں میں ضائع کردی۔" روی نے جو اس انکشاف سے حیرت زدہ سا تھا بیٹھا تھا گردن گھما کر انہیں دیکھا۔

"آپ نے شادی سے پہلے ان سے پوچھ لیا تھا دادا جان؟"

"پوچھا تھا بیٹا لیکن اس نے انتخاب کا حق ہمیں دے دیا تھا۔ ہم تو اس کی فرمانبرداری پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ وہ مینا کو ناپسند کردے گا۔ پتا نہیں کس نے اس کے دل میں یہ خناس پیدا کردیا تھا کہ مینا کا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ تمہاری ماں دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ہے پتر۔"

"میں جانتا ہوں دادا جان لیکن ابا تو ہر لمحہ انہیں ڈی گریڈ کرتے رہتے ہیں اور ان کی عزتِ نفس مجروح کرتے ہیں جیسے وہ کوئی بہت حقیر مخلوق ہوں۔"

"میں سمجھاؤں گا بات کروں حبیب سے۔ دو چار روز تک چکر لگاؤں گا میں۔" انہوں نے وعدہ کیا تھا لیکن وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکے تھے۔ روی کے گاؤں سے واپس آنے کے دو دن بعد ان کا انتقال ہوگیا تھا۔

"نہیں۔" اسے یقین نہیں آرہا۔ وہ اماں کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کتنے پلان بنا ڈالے تھے۔ دادا جان آئیں گے تو وہ انہیں کچھ دنوں کے لیے روک لے گا۔ جتنی دیر وہ وہاں رہا تھا کتنا تحفظ کا احساس ہوا تھا اسے جیسے وہ کسی گھنے درخت کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں تلے بیٹھا ہو اور کتنا بدنصیب تھا اس کا باپ جس نے خود کو اس چھاؤں سے محروم کر رکھا تھا۔ اس نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ اگر ابا نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو وہ اماں اور گڑیا کو لے کر گاؤں چلا جائے گا دادا جان کے پاس۔ آخر ابا نے بھی تو اسی گاؤں میں رہ کر اتنا زیادہ پڑھ لیا تھا وہ بھی پڑھ لے گا۔

"احمق عورت خود بھی روئے چلی جارہی ہے اور اسے بھی رُلا رہی ہے۔ بتاؤ اسے کہ کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا اس کا اس سے کچھ نہیں لگتا تھا وہ اس کا۔" تب اماں نے روی کو الگ کرتے ہوئے ایک شاکی نظر ان پر ڈالی تھی۔ وہ جو کبھی نہیں بولی تھیں آج چپ نہیں رہ سکی تھیں۔

"آپ کے حوالے سے نہ سہی میرے حوالے سے تو اس کا رشتہ ہے۔ دادا نہ سہی نانا تو لگتے ہیں سگے ماموں ہیں میرے۔"

"اوہ ہاں، بھول گیا تھا تمہیں ہی تو میرے سر منڈھنے کے لیے انہوں نے پالا تھا مجھے۔" وہ کہتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے تھے اور روی اماں کو

گلے لگا کر تسلی دینے لگا تھا۔

☆☆☆

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" سیمل برآمدے میں تخت کے پاس کھڑی تھی اور نوشیرواں ذرا فاصلے پر کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے میں بجلی روشنی کا بلب جل رہا تھا اور اس کی روشنی سیمل کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا سا سفید دوپٹا نماز کے انداز میں لپیٹے ہوئے تھی اور نوشیرواں کو وہ اس وقت کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر وہ گھبرائی اور پیچھے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا تو نوشیرواں نے چونک کر اس سے نظریں ہٹالیں اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"شکریہ کیسا سیمل...... میں نے ایسا کیا کیا ہے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا تھا کہ...... اور ویسے بھی۔" اس نے پھر اس پر ایک نظر ڈالی۔ "مجھے تو اماں جان نے ڈاکٹر کو لانے کے لیے کہا تھا آپ نے نہیں...... سو آپ اماں جان کا شکریہ ادا کریں۔"

"جی ان کا بھی شکریہ ادا کروں گی۔" وہ دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے سادگی سے کہہ رہی تھی اور نوشیرواں عادل کا دل زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے لیے یوں دھڑکا تھا کہ وہ خود حیران سا رہ گیا تھا۔

"لیکن آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی تو میرا فرض بنتا ہے سر۔"

"سر۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔ "آپ اتنی فارمل کیوں ہیں سیمل بی بی؟"

"اور آپ اتنے بے تکلف کیوں ہیں۔" سیمل نے سوچا تھا لیکن کہا نہیں...... یہ دوسری بار تھی جب وہ اس سے مل رہی تھی اور دونوں بار ہی اس نے سیمل کی مدد کی تھی۔ اماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ یکدم ہی ان کی سانس رکنے لگی تھی۔ وہ گہری گہری سانس لے رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر میراں اماں کو آواز دی تھی۔

"اماں جان...... اماں جان پلیز آ جائیں۔ اماں کو کچھ ہو گیا ہے۔" روتے ہوئے اس نے کرسی پر چڑھ کر انہیں آواز دی تھی اور پھر بھاگ کر اماں کے پاس آئی تھی جو تخت پر لیٹی یونہی منہ کھولے گھٹی گھٹی سانس لے رہی تھیں۔

"اماں...... اماں...... اماں مجھے چھوڑ کر مت جایئے گا۔ اماں میں آپ کے بغیر اکیلی کیسے زندہ رہوں گی مر جاؤں گی۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑے رو رہی تھی جب میراں اماں نے صحن کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تھا اور ان کے پیچھے نوشیرواں بھی تھا۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے اس کے قریب آئی تھیں۔

"نہ رو بچے ان شاءاللہ خیر کرے گا۔" اور اماں نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اماں کو دیکھ رہی تھی جب میراں اماں نے مڑ کر نوشیرواں سے کہا تھا۔

"شیری بچہ جلدی سے گاڑی نکالو۔ امینہ بہن کو ہسپتال لے کر جانا ہے، جلدی بیٹا۔" نوشیرواں وہاں سے واپس مڑ گیا تھا اور پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"دعا کرو بچے اللہ تمہاری ماں کو صحت اور زندگی دے گا۔" وہ تو بس خالی خالی نظروں سے اماں کو دیکھ رہی تھی جو بند آنکھیں لیے ساکت پڑی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز آتی جیسے اندر کہیں سانس رک رہی ہو۔ میراں اماں پتا نہیں کیا کہہ رہی تھیں۔ اسے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ تب میراں اماں نے خود ہی دروازے لاک کیے تھے، اسے چادر دی تھی اور نوشیرواں عادل دبلی پتلی کمزور سی اماں کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ وہ اور میراں اماں ان کے ساتھ تھیں۔ اماں نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں لیکن ان کی سانس اسی طرح آ رہی تھی رک رک کر۔ اس نے بہت احتیاط سے اماں کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا تھا ساتھ وہ بیٹھی تھی ان کو سہارا دیے اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

اس وقت مروان اسے بے حد یاد آ رہا تھا۔ میراں اماں آگے بیٹھی تھیں نوشیرواں کے ساتھ اور پھر اسپتال میں نوشیرواں ہی انہیں یونہی بازوؤں میں اٹھائے تیز تیز ایمرجنسی کی طرف چلا تھا اور وہ اس کے پیچھے تقریباً بھاگ رہی تھی۔ اماں کو دمے کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا۔ دو تین گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ گھر آئے تھے۔

"اگر نوشیرواں اور میراں اماں نہ ہوتیں تو......"

اس نے جھرجھری لے کر نوشیرواں کو دیکھا۔

"میں سچ مچ آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ مروان کو بتاؤں گی تو وہ بھی آپ کا ممنون ہوگا۔ اگر آپ نہ ہوتے تو پتا نہیں اماں کو کیا ہو جاتا۔" اس کی آواز بھرا گئی اور پلکیں بھیگنے لگیں۔

"اوں ہوں...... اب مزید برسات نہیں ہو گی۔ میں نے آپ کا اور مروان کا شکریہ قبول کر لیا ہے...... " سیمل نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"مروان کو اماں سے بہت محبت ہے مجھ سے بھی زیادہ...... وہ تو آپ کا بہت احسان مند ہوگا۔"

"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔" نوشیرواں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں، بہت دیر ہو گئی ہے آپ جائیں۔" وہ جلدی سے بولی اور نوشیرواں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہرے اور یہ بات اس نے اسی وقت محسوس کر لی تھی جب میراں اماں نے کہا تھا۔

"بچہ تم گھر جاؤ آرام کرو۔ میں رات سیمل بچی کے پاس ہی رہوں گی۔ رات خدانخواستہ امینہ کی طبیعت خراب ہوئی تو اکیلے گھبرا جائے گی۔" سیمل جو اماں کی چارپائی پر بیٹھی ان کے بازو دبا رہی تھی یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔

"آئیں میں دروازہ بند کر لیتی ہوں۔"

"اس منافقت بھری دنیا میں رہتی اس لڑکی میں رتی بھر منافقت نہیں ہے۔ کتنی خالص لڑکی ہے۔" بیرونی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے نوشیرواں نے سوچا تھا۔ "کیا یہ لڑکی واقعی اسی دنیا کی باسی ہے۔" اور مڑ کر اسے دیکھا تھا جو دیوار پر پڑتے اس کے سائے پر نظریں جمائے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ گیٹ لاک کر کے وہ کھوئی کھوئی سی واپس آئی۔ نوشیرواں عادل آج اسے کئی بار مروان کی طرح لگا تھا۔ اس میں کچھ ایسا تھا ضرور جو مروان کی طرح تھا۔ شاید اس کے بالوں کا کٹ...... اس کے چلنے کا انداز اور...... اور پتا نہیں کیا۔

وہ کمرے میں آئی تو اماں دوائیوں کے زیر اثر پرسکون نیند سو رہی تھیں۔ ان کی سانس بھی اب ٹھیک آ رہی تھی۔ اور میراں اماں کرسی بیڈ کے نزدیک رکھے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے بیڈ جھاڑ انکیہ درست کر کے رکھا۔

"اماں جان آپ ادھر بیڈ پر آ کر لیٹ جائیں...... میں اماں کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

"تم نے کھانا کھا لیا بیٹا؟"

"اوہ...... آپ کے لیے کھانا لاؤں؟"

"نہ بیٹا، میں نے تو مغرب کے بعد کھانا کھا لیا تھا۔ اب تو عشا کی نماز پڑھ رہی تھی جب تم نے آواز دی۔ چلو تم اٹھو شاباش پہلے کھانا کھالو پھر آ کر لیٹ جاؤ۔ تمہاری اماں سکون سے سو رہی ہیں۔" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ سے اٹھایا۔

"اچھا آپ تو لیٹ جائیں، بہت دیر ہو گئی ہے۔ آپ تو بہت سویرے جاگتی ہیں۔" وہ سر ہلا کر

بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ یسل ایک نظر اماں پر ڈال کر باہر چلی گئی پھر کچن میں جا کر دودھ گرم کر کے دو کپ لے کر کمرے میں آئی۔

''اماں جان یہ دودھ لے لیں۔''

''ارے بچی' یہ تم نے کیوں تکلف کیا۔ شیری بھی ایسے ہی کرتا ہے۔ جی چاہے یا نہ چاہے وہ رات کو سونے سے پہلے ضرور میرے لیے دودھ گرم کر کے لے آتا ہے۔'' وہ محبت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ یسل نے اسٹور سے میٹرس نکال کر اماں کے بیڈ کے پاس نیچے کارپٹ پر بچھایا اور میٹرس پر بیڈ شیٹ بچھا کر تکیہ رکھ کر اماں کی طرف دیکھا۔ وہ اسی سکون سے سو رہی تھیں۔ جب میراں اماں کو چادر اوڑھا کر لیٹنے سے پہلے اس نے میراں اماں سے کہا۔

''آپ کو دبا دوں اماں جان۔''

''ارے نہیں بچے سو جاؤ تم۔'' انہوں نے شفقت بھری نظر اس پر ڈالی اور مسکرائیں۔

''تم بالکل زینے کی طرح ہو۔ وہ بھی رات کو سونے سے پہلے ضرور میرے کمرے میں آتی تھی اور پوچھتی تھی۔ آپ کو دبا دوں بڑی اماں......''

''زینے کون تھی؟'' یسل نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میری پوتی تھی۔ بہت پیاری بہت خوب صورت، شکل کی بھی دل کی بھی...... صرف سترہ سال کی عمر تھی اس کی تب......''

''کیا وہ بھی......؟'' یسل کا دل کانپ گیا۔

''ہاں وہ بھی بچے...... پورے سترہ بندے تھے۔'' یسل کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ یہ میراں اماں کا دل تھا کہ بچھڑ کر چھوڑ کر جانے والوں کا غم، اور ان کا حوصلہ۔ اس کا دل جیسے پانی ہو کر بہنے لگا۔ وہ یسل تھی جسے کہانیوں کے دکھ رلاتے تھے اور یہ تو کہانی نہیں تھی۔ سامنے جیتی جاگتی میراں اماں تھیں جن کا سینہ چھلنی تھا لیکن جو اس کے لیے چھپر چھاؤں بنی ہوئی تھیں۔ سرخ و سپید رنگت اور سفید بالوں والی میراں اماں کا دل کیسا سمندر تھا۔ اس نے عقیدت سے انہیں دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔

''اماں جان......'' اور آنسو اس کی آنکھوں سے چشموں کی طرح پھوٹ نکلے۔

''ارے...... ارے میرا بچہ مت رو۔'' وہ اسے بولتے ہوئے چپ کرانے لگیں لیکن ایسا کرتے ہوئے خود ان کی آنکھیں برس پڑی تھیں اور کتنے سارے دنوں بعد وہ یوں روئی تھیں۔

''یا اللہ میرے شیری کو سلامت رکھنا۔ میرے کل کو صحت و زندگی دینا، وہ جہاں بھی ہو۔ میرے خاندان کے یہ نام لیوا زندہ رہیں، میرے خاندان کی نسل باقی رہے مولا۔'' دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے انہوں نے اپنے اور اس کے آنسو پونچھے۔

''بس میرا بچہ بس جا منہ ہاتھ دھو کر سو جا۔ کیسا سونے سے ترشا دل ہے تیرا...... بس تو جانے والوں کے لیے ان کے حق میں دعا کیا کر۔ اللہ انہیں جنت کی ہوائیں دے، ان کی قبریں کشادہ کرے۔'' اور منہ ہاتھ دھو کر جب وہ میٹرس پر آ کر لیٹی تو میراں اماں چہرے پر دوپٹا ڈالے کروٹ کے بل لیٹی تھیں۔

''شاید انہیں روشنی میں نیند نہیں آتی ہوگی۔'' اس نے سوچا اور اٹھ کر لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلا دیا لیکن سونے سے پہلے اس نے اماں کو دیکھا تو وہ اسی طرح گہری اور پرسکون نیند سو رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ میٹرس پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ ابھی مروان کو بتائے کہ میراں اماں کتنی دکھی ہیں۔ پہاڑ سے غم کا بوجھ سینے پر دھرے سب کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہیں۔ اسے تو بچپن سے عادت تھی اپنی ہر بات مروان کو بتانے کی۔ لیکن میراں اماں لائٹ جلنے سے شاید ڈسٹرب ہو جاتیں۔ وہ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ میراں اماں اور ان کے خاندان کے ان سترہ بندوں کے متعلق سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ آج بہت دنوں بعد اس نے پھر وہی خواب دیکھے تھے جو اکثر بچپن میں دیکھتی تھی اور مروان ان خوابوں پر ہنستا تھا۔

اس نے ''ایک مکان دو دیواروں'' کے امجد کو دیکھا تھا۔ بوڑھی چالاک نانی نے صحن کے بیچوں بیچ دیوار کھڑی کر دی تھی اور دیوار کے اس طرف تنہا کھڑا امجد جو اپنی شرارتوں سے سب کو زچ کر دیتا تھا رو رہا تھا وہ بند مٹھیوں سے آنسو پونچھتا جاتا تھا اور آنسو تھے کہ بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اس نے قریب جا کر امجد کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے تھے۔ اسے تسلی دی تھی۔ تم اکیلے نہیں ہو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ اور امجد مسکرا دیا تھا پھر اس نے سینڈریلا کو تسلی دی تھی جس پر سوتیلی ماں ظلم کر رہی تھی۔ اس نے سنو وائٹ کو زہر ملا سیب کھانے سے منع کیا تھا اور جانے صبح تک اس نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے اور پھر اس نے مروان کو دیکھا تھا وہ دوڑ کر مروان سے لپٹ گئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے مسکرا رہا تھا پھر اس نے پیچھے مڑ کر کسی کو بلایا تھا۔

''عادل...... اس سے ملو میری چھوٹی بہن یسل''

اور سر پر دوپٹا درست کر کے وہ جلدی سے مروان سے الگ ہوئی تھی اور اُدھر دیکھا تھا۔ وہ نوشیرواں عادل تھا جو مسکراتے ہوئے ایک ٹانگ پر تھوڑا سا دباؤ ڈالتا ہوا مروان کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ اور وہ جو نوشیرواں کو دیکھ کر اکثر سوچتی تھی کہ بھلا اس میں اور مروان میں کیا ایک جیسا ہے...... دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر یکدم چونکی تھی۔ دونوں کے بالوں کا کٹ ایک جیسا تھا۔

''عادل یار اس کا خیال رکھنا، میری یہ بہن بہت

تم کیوں چلے گئے

یہ غزل میں اپنی پیاری کزن رابعہ تبسم کے نام کرتی ہوں جو صرف 22 سال کی عمر میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

سوچوں پہ غم کی شال ہے تم کیوں چلے گئے
ہر سمت ایک جال ہے تم کیوں چلے گئے

تازہ تمام زخم بہاروں نے کر دیے
ہر پھول کا سوال ہے تم کیوں چلے گئے

ہنسنا تو خیر اپنا مقدر نہ تھا کبھی
رونا بھی اب محال ہے تم کیوں چلے گئے

کیوں ہاتھ میں نہیں ہے مری جاں تمہارا ہاتھ
کتنا برا یہ حال ہے تم کیوں چلے گئے

تم نے تو جاتے جاتے ملاقات تک نہ کی
اب تک یہی ملال ہے تم کیوں چلے گئے

مرسلہ: صبا علیہ

غلطی

مالک نوکر سے۔ ''اس قدر مہنگائی اور پراٹھے میں اس قدر گھی؟''

نوکر: ہچکچاتے ہوئے۔ ''وہ معاف کیجیے گا غلطی سے میرا پراٹھا آپ کے پاس آ گیا ہے۔''

سیدہ فرزانہ عرفان، حجرہ شاہ مقیم

نازک دل ہے۔ کہانیاں پڑھ کر روتی اور ہنستی ہے۔"
پھر اس نے سیمل کا ہاتھ پکڑ کر عادل کی طرف بڑھایا تھا کہ یکدم کسی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر میٹرس پر بیٹھ گئی۔ میراں اماں واش روم سے نکل رہی تھیں۔ شاید یہ دروازہ کھلنے کی آواز تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا پھر کمرے میں نظر دوڑائی، اسے لگا جیسے ابھی ابھی مروان اور نوشیرواں کمرے سے باہر گئے ہوں۔ اماں اس کی طرف کروٹ لیے سو رہی تھیں۔ ساری رات وہ سکون سے سوتی رہی تھیں۔ بس ایک بار شروع رات میں پانی مانگا تھا۔ اس نے میراں اماں کی طرف دیکھا جو اب جا نماز پر بیٹھ چکی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جلدی سے وضو کرلو بیٹا وقت کم ہے۔ میری آنکھ بھی آج دیر سے کھلی۔"

"جی۔" وہ تیزی سے واش روم کی طرف بڑھ گئی لیکن جاتے جاتے اس نے دیکھ لیا تھا کہ میراں اماں کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور چہرہ ستا ہوا تھا۔

"کبھی کبھی یوں اچانک بچھڑ جانے والوں کا دکھ کتنا ستاتا ہے۔" منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے بھی وہ مسلسل میراں اماں کے متعلق سوچ رہی تھی۔

"اگر میراں اماں یہاں پڑوس میں آکر نہ رہتیں تو میں کیا کرتی میراں اماں نے کتنا ساتھ دیا ہے میرا جب جب اماں بیمار ہوئی ہیں تب تب۔ شکر ہے اللہ کا میراں اماں یہاں آکر رہنے لگیں۔ نہیں، یہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" اس نے ہولے سے اپنے رخسار پر تھپڑ مارا۔ "کاش میراں اماں کو کبھی یہاں نہ آنا پڑتا۔ کبھی نہیں، وہ ہمیشہ وہاں رہتیں اپنے گھر میں اپنے لوگوں کے ساتھ۔" وضو کرکے وہ بہت افسردہ دلی کے ساتھ باہر آئی تھی۔ میراں اماں نماز پڑھ کر فارغ ہو چکی تھیں اور اب تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ وہ جا کر جا نماز پر کھڑی ہو گئی۔ نماز پڑھ کر اس نے جلدی جلدی چائے بنائی تھی اور جب ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے وہ کمرے میں آئی تو میراں اماں، اماں کے بیڈ پر بیٹھی تھیں اور اماں کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لیے ہولے ہولے کچھ کہہ رہی تھیں۔ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے مسکرا کر اماں کی طرف دیکھا۔

"آپ جاگ گئیں اماں جی، طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" اماں نے سر ہلایا تھا۔

"آپ چائے لے لیں نا اماں جان۔"

"شیری بھی جب صبح صبح میں نماز پڑھ کر فارغ ہوتی ہوں تو چائے بنا کر لے آتا ہے۔" میراں اماں مسکرائی تھیں۔

میراں اماں کو چائے دے کر وہ اماں کو واش روم لے گئی۔ اماں چپ چاپ کسی روبوٹ کی طرح اس کے ساتھ چلتی ہوئی واش روم گئی تھیں اور جب وہ ان کا منہ ہاتھ دھلا کر انہیں باہر لائی تو میراں اماں چادر اوڑھے کھڑی تھیں۔

"ارے، آپ جا رہی ہیں اماں جان... نہیں آپ ناشتا کرکے جائیں گی۔ آپ ناشتے میں کیا لیں گی پراٹھا آملیٹ یا......"

"نہیں، میں ابھی ناشتا نہیں کروں گی۔ چائے پی ہے ابھی تو...... اب تو دس بجے تک ناشتا کروں گی۔"

"تو ٹھیک ہے میں دس بجے ناشتا بنا دوں گی آپ کا۔"

"نہیں بچہ شیری نے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے۔ وہ ناشتے پر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"میں بنا دیتی ہوں ان کے لیے ناشتا۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ میراں اماں مسکرائی تھیں اور یہ مدھم سی مسکراہٹ ان کے سرخ و سپید چہرے پر کتنی سجتی تھی۔

"نہیں سیمل بچے۔ اس نے ناشتا تو بنا ہی لیا ہوگا۔ جب یہاں ہوتا ہے تو مجھے ناشتا کب بنانے دیتا ہے۔ میں تو ابھی تلاوت سے فارغ بھی نہیں ہوتی وہ ناشتا تیار کرکے لے آتا ہے۔ پریشان مت ہونا میں شیری کے جانے کے بعد چکر لگاؤں گی۔"

"وہ اسلام آباد کیوں جا رہے ہیں، جاب کرتے ہیں وہاں؟"

"نہ بچہ......" ان کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی تھی اور آنکھوں سے جیسے کوئی گہرا درد جھلکنے لگا تھا۔

"وہ تو گل کے لیے جا رہا ہے، اس کا پتا کرنے...... میرا پوتا گل، ریحان گل نام ہے اس کا...... ادھر پشاور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ گیارہ ماہ ہوگئے ہیں کچھ پتا نہیں اس کا۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی اور سیمل جیسے وہیں منجمد ہو گئی تھی۔ "میرے خاندان کے بچ جانے والے تین بندے اور ان میں سے بھی......"

"اور پتا نہیں ریحان گل زندہ بھی ہوگا یا کسی نے اسے......"

"نہیں۔" اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور میراں اماں کی طرف دیکھا جو چادر اوڑھے دروازے کی طرف مڑ چکی تھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل دی۔

☆☆☆

دادا جان کی اس طرح اچانک موت نے روحی کو بالکل خاموش کر دیا تھا۔ بہت سے دن وہ بالکل چپ رہا۔ گڑیا اور اماں سے بھی کم باتیں کیں لیکن پھر آہستہ آہستہ ہوتے سنبھل گیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ ابا سے کچھ کہنا فضول ہے۔ وہ ایک خود پسند اور مغرور شخص ہیں جنہیں اپنے سامنے سب حقیر لگتے ہیں، کمتر اور گھٹیا۔ حالانکہ وہ خود کیا تھے، اگر دادا جان انہیں یتیم خانے سے نہ لاتے تو آج پتا نہیں کہاں گلیوں میں رُل رہے ہوتے۔ اس روز وہ کالج سے جلدی آگیا تھا اس نے گڑیا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج اسے آئس کریم کھلانے لے جائے گا۔ اور جب اماں کو گڑیا کو تیار کروانے کا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گیا تو کچھ ہی دیر بعد اس نے ابا کی دہاڑتی آواز سنی تھی۔

"احمق عورت کیا کہا تھا صبح میں نے تم سے۔"

اماں نے پتا نہیں کیا کہا تھا۔ ان کی مدھم آواز اس کے کانوں تک نہیں آئی تھی لیکن ابا کی آواز پھر آئی تھی۔

"لے جاؤ انہیں اور آگ میں جھونک دو اور وہ بلیک پینٹ اور پنک دھاری والی شرٹ استری کروا کے لاؤ۔"

"اماں گڑیا کو تیار کر رہی تھیں۔" یکدم ہی اسے خیال آیا اور وہ تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ گڑیا صوفے کے پیچھے چھپی کھڑی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں خوف سے مزید پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا جو زمین پر پڑے ابا کے کپڑے اٹھا رہی تھیں۔ وہ سیدھا گڑیا کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے کے پیچھے سے باہر لایا۔ صوفے پر پڑا اس کا ربڑ بینڈ اور برش اٹھایا اور ابا کی طرف دیکھے بغیر گڑیا کا ہاتھ پکڑے واپس سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اماں ابا کے کپڑے لیے لاؤنج سے نکل رہی تھیں جب آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور عین اسی وقت ابا نے ایش ٹرے اٹھا کر غصے سے لاؤنج سے نکلتی اماں پر پھینکی۔ کرسٹل کی ایش ٹرے ایک چھناکے سے ٹوٹی تھی، وہ بغیر رکے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ گڑیا پنک فراک میں پری لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کا خوف اسے اندر سے رُلا رہا تھا لیکن وہ تیار کرتے ہوئے گڑیا سے باتیں کرتا رہا اس کے بالوں میں برش کرکے کیچر لگا کر وہ نیچے آیا تو ابا جا چکے

اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ دھرے ٹی وی پر کوئی انڈین شو نہایت انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر اماں کی طرف متوجہ ہوا تھا جو خود ہی ٹرالی دھکیلتی آرہی تھیں۔

"اماں جی۔" اسے غصہ آیا۔ "نازو کہاں مر گئی ہے، وہ چائے لے آتی، آپ تیار ہو جاتیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا۔"

"وہ بیٹا۔" انہوں نے گھبرا کر حبیب خان کی طرف دیکھا۔ "میں جا کر کیا کروں گی بیٹا تم گڑیا کو لے جاؤ۔" ٹرالی ابا کے سامنے کھڑی کر کے انہوں نے جلدی سے پلیٹ انہیں پکڑائی تھی۔ جسے انہوں نے نہایت نخوت سے پکڑ لیا اور اب تنقیدی نظروں سے ٹرالی کا جائزہ لے رہے تھے۔ نگٹس، چکن پیٹیز، شامی کباب، رول سب کچھ ہی ان کی پسند کا تھا۔ وہ آفس سے آکر اکثر کھانا نہیں کھاتے تھے اس لیے اماں چائے پر خاصا تردد کرتی تھیں۔ کھانا وہ رات کو ہی کھاتے تھے اور اچھے کھانے کے شوقین تھے۔

"نہیں اماں جی! آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔" اس نے گڑیا کا ہاتھ چھوڑ کر قریب آکر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "آئیں، ایسے ہی ٹھیک ہے بس چادر لے لیں۔" اماں نے سوالیہ نظروں سے حبیب خان کی طرف دیکھا۔

"وہ گڑیا آئسکریم کھانے کی ضد کر رہی تھی اور کہتی ہے اماں بھی ساتھ چلیں۔"

"تو جاؤ مرو یہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو اسٹیچو بن کر۔" انہوں نے ایک تمسخر بھری نظر ان پر ڈالی تھی۔ جب اماں چادر لینے باہر چلی گئی تھیں اس نے بغیر ابا سے پوچھے گاڑی کی چابی اٹھائی تھی تو اسی تمسخر بھری نظروں سے روی کو دیکھتے ہوئے ہنسے تھے۔

"یہ اپنی اماں کو تولے کر جا رہے ہو کوئی دوست وغیرہ مل گیا تو کیا کرو گے؟" روی کی آنکھوں میں پہلے حیرت اتری تھی پھر اس کا گندمی رنگ غصے کی اور غم کی زیادتی سے سرخ ہو گیا تھا۔

"مجھے اپنی اماں کے ساتھ چلتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے، مجھے اپنی ماں دنیا کی ساری عورتوں سے زیادہ خوب صورت لگتی ہے اور میں ہمیشہ اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔" پھر ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر گڑیا کا ہاتھ پکڑے تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس روز اس نے پہلی بار اماں کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ وہ ہنسی تھیں اور وہ مبہوت سا ہو کر انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ آئسکریم کھاتے ہوئے، کے ایف سی میں چکن پیس کھاتے اور پھر کافی ہاؤس میں آئس کافی پیتے ہوئے اس نے اماں کی آنکھوں میں خوشی کے جو ستارے دمکتے دیکھے تھے وہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور وہاں ہی کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ اب اپنی ماں اور بہن کا اسے خود خیال رکھنا ہے۔ گڑیا جو گھر میں ڈری سہمی رہتی تھی اس وقت چہک رہی تھی اور اماں کی آنکھوں کا خوف اور چہرے پر چھائی بے بسی اور بے چارگی اس وقت کہیں نہیں تھی۔

"اماں جی......" ان کا ہاتھ اپنے توانا ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی۔

"اب ہم ہر ویک اینڈ پر باہر آیا کریں گے۔"

"نہیں۔" اماں ایک بار پھر سہم گئی تھیں۔

"تمہارے ابا بہت ناراض ہوں گے روی، بہت خفا ہوں گے۔"

"ہوتے رہیں اماں جی۔" اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔ "یہ چند گھنٹے جو ہم نے آپ نے اور گڑیا نے گھر سے باہر گزارے ہیں یہ ہماری زندگی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ یہ تازہ ہوا کے جھونکے ہیں جو اس گھر میں نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے لیے خوشیوں کے چند لمحے تلاش کرنے کا حق ہے اور میں یہی حق استعمال

کروں گا آپ ابا کی پروا نہیں کریں۔"

اور وہ کیسے پروا نہیں کرتیں...... وہ رات جو انہوں نے گزاری تھی اس کی اذیت انہوں نے کیسے برداشت کی تھی یہ وہی جانتی تھیں۔ اس رات بڑے دنوں بعد وہ ان کے کمرے میں آئے تھے۔ آج انہوں نے بچوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ یوں خوش ہوئی تھیں۔ بچوں کی خوشی کے خیال سے ان کی آنکھیں دمک رہی تھیں اور رخساروں پر جیسے رنگ سے بکھرے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھیں اور ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں اور کمن سی نگاہیں جھکائے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی حبیب خان کی نظر ان کے چہرے پر پڑی تھی اور وہ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

یہ امینہ تھی ان کی بیوی اتنی دلکش، ایک لحظہ حیرت تھا جس سے گزر کر وہ ان کے قریب آئے تھے اور پھر لمبی انگلیاں ان کے بازو میں چبھو دی تھیں۔ اذیت سے ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا لیکن حبیب خان کے ناخن ان کی کھال ادھیڑ چکے تھے۔

"یہ روی کو کیا سبق پڑھاتی رہتی ہو تم؟" انہوں نے ہونٹ بھینچ کر نگاہیں جھکالی تھیں۔ تب ان کی ٹھوڑی کے نیچے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا رکھ کر ان کا چہرہ اونچا کیا تھا۔

"بغاوت سکھا رہی ہو میرے خلاف، میرے مقابلے پر کھڑا کرو گی اسے۔" انہوں نے ہاتھ ہٹا کر ایک تھپڑ ان کے رخسار پر مارا تھا۔

"اب تو تڑی (زبان) بند ہو گئی ہے تیری۔ بتا کیا کہا ہے تو نے اسے۔" دایاں ہاتھ رخسار پر رکھتے ہوئے امینہ کا دل جیسے ہزاروں کرچیوں میں تقسیم ہوا تھا۔

"میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود ہی...... گڑیا

کی وجہ سے......"

"اچھا......!" انہوں نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی انگلیاں ان کے بازوؤں میں چبھوئی تھیں۔

"بکواس کرتی ہو میرے ساتھ...... وہ میرا بیٹا ہے اگر آئندہ کوئی پلاننگ کی تو طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا اور بچے چھین لوں گا تم سے۔"

"نہیں...... نہیں پلیز......" امینہ نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میں منع کر دوں گی نہیں جاؤں گی پھر کبھی۔" اور ان کے بازو سے ہاتھ ہٹا کر وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ اور اب دوسری طرح کی اذیت شروع ہوئی تھی۔ ان کے گداز بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے ان کے ہونٹوں سے زہر نکلا تھا۔

"یہ آدھی آستین والی قمیص پہن کر کیا باہر مردوں کو دکھانے گئی تھیں۔ کوئی نہیں رہتا تم پر۔"

"نہیں ...... وہ میں نے تو چادر لپٹی ہوئی تھی۔" انہوں نے بہ مشکل سسکی کو ہونٹوں میں ہی دبایا تھا۔

"میری تو مجبوری ہے کہ تم میری بیوی ہو اور مجھے ایک دن اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے ورنہ تم جیسی عورت پر میرے جیسا کوئی مرد تھوکتا بھی نہیں۔" اور ان کا جی چاہا کہ وہ کہیں پھر آپ مجھے فارغ کیوں نہیں کر دیتے اور کسی من پسند عورت سے شادی کیوں نہیں کر لیتے لیکن ہمیشہ کی طرح وہ کچھ نہیں کہہ سکی تھیں اور بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی تھیں۔ اور صبح انہوں نے روی سے بازوؤں کے نیل اور کھرنڈ چھپانے کے لیے فل آستین کی شرٹ پہن لی تھی لیکن پھر بھی ناشتے کی ٹیبل پر روی انہیں کھوجتی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔

"ابا نے کچھ کہا؟" چودھری حبیب خان جب ناشتا کر کے اٹھ گئے تو روی نے پوچھا۔

"نہیں تو انہوں نے تو کچھ نہیں کہا۔" انہوں نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ باپ بیٹا متقابل آجائیں۔

"اچھا۔" روی کی گہری نظریں انہیں اندر تک اترتی محسوس ہوئی تھیں۔

"اگر وہ کچھ کہیں تو آپ بھی جواب دیا کریں، یوں چپ سادھ کر نہ بیٹھا کریں، وہ اور بھی شیر ہوتے ہیں۔ بلا وجہ آپ پر ہاتھ اٹھائیں تو آپ ان کا ہاتھ پکڑلیں۔ لوگ ہم پر اس لیے زیادتی کرتے ہیں کہ ہم انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کرتے۔ ہم انہیں اپنے ساتھ زیادتی کرنے دیتے ہیں۔" وہ آج انہیں نیا سبق پڑھا رہا تھا۔ انہیں یکدم روی پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ ایسا کچھ کبھی بھی نہیں کرسکیں گی۔

ماموں ممانی اور ماں کی لاڈلی امینہ جو ہروقت چہکتی رہتی تھی اور ماموں پیار سے اسے مینا کہا کرتے تھے۔ حبیب کی زندگی میں آکر ایسی چپ ہوئی تھی کہ کوئی بات کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچتی تھی۔ حبیب خان نے پہلے روز ہی اسے ریجیکٹ کردیا تھا۔

"تم میرے قابل ہرگز نہیں تھیں۔ دراصل ابا نے مجھے پال کر جو احسان مجھ پر کیا تھا اس کا بدلہ لیا ہے مجھ سے۔ اور میں نے بھی تمہیں قبول کرکے وہ احسان چکا دیا ہے۔" وہ حیران سی حبیب کو دیکھتی رہ گئی تھی جس نے نظر بھر کر اسے دیکھا بھی نہیں تھا حالانکہ اس کی سہیلیوں نے کتنی ہی بار اسے بتایا تھا کہ آج اس کے روپ پر نظر نہیں ٹھہر رہی۔ آج تو حبیب بھائی چاروں شانے چت گر جائیں گے۔ تاب نہیں لاسکیں گے اس قیامت حسن کی۔ اس روز اور اس کے بعد کتنی ہی بار انہوں نے سوچا تھا وہ کتنی بدنصیب ہیں لیکن آج انہیں روی کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ نہیں وہ تو بڑی خوش نصیب ہیں۔ ان کا بیٹا کتنا پیارا اور کتنا بانکا تھا۔ "یا اللہ روی کو نظرِ بد سے بچانا۔" انہوں نے فوراً ہی اس کے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

روی سے وعدہ کرلینے کے باوجود وہ اپنے اندر ہمت پیدا نہ کرسکی تھیں اور جب اگلے ویک اینڈ پر روی نے انہیں باہر چلنے کو کہا تو وہ سہم گئی تھیں۔ اس رات کی اذیت رگ و پے میں زندہ ہوگئی تھی۔ بازوؤں میں جلن ہونے لگی تھی جہاں اب بھی ناخنوں کے کھرنڈ موجود تھے۔

"نہ بیٹا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہوا؟" وہ پریشان ہوا تھا۔

"بس طبیعت اچھی نہیں ہے تم اور گڑیا چلے جاؤ" لیکن ان کے بغیر دونوں کو زیادہ مزہ نہیں آیا تھا اور وہ دونوں ہی جلدی واپس آگئے تھے۔ اور پھر جب اگلی بار بھی انہوں نے جانے سے انکار کیا تو روی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اماں ابا سے خوف زدہ ہیں۔ اس روز وہ گڑیا کو باہر سے گھما کر لے آیا تھا لیکن دوسرے روز شام کی چائے پیتے ہوئے اس نے اماں سے کہا تھا۔

"اماں آج رات باہر کھانا کھانے چلیں گے۔ آپ تیار ہوجایئے گا۔" اور ابا کے حسد سے بگڑتے نقوش کو دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہوا تھا۔ اور بہت دنوں بعد اس نے حبیب خان کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ بھی چلیں۔"

"میں۔" انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا اور نخوت سے ان کی گردن اکڑ گئی۔ "میں اس عورت کے ساتھ باہر کسی ہوٹل میں کھانا کھانے جاؤں۔"

"یہ عورت آپ کی بیوی ہے۔" روی کی آنکھوں میں غصہ۔۔۔ مل کھا رہا تھا۔ "اور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کہیں باہر جاکر کھانا کھانا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔"

"تمہیں لگتا ہے کہ یہ عورت میری بیوی بننے کے قابل تھی؟" ان کے نتھنوں سے جیسے دھواں نکل رہا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ آپ میری ماں کے قابل نہیں تھے۔" اماں کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہوگیا اور ان کے ہاتھوں کی لرزش روی سے چھپی نہ رہ سکی تھی جبکہ وہ غصے سے ٹرالی کو ٹھوکر مارتے ہوئے کھڑے ہوگئے تھے۔ ٹرالی الٹ گئی اور چیزیں نیچے کارپٹ پر بکھر گئی تھیں۔

"میں اس عورت کے قابل نہیں۔" انہوں نے اماں کو دھکا دینے کے لیے بازو آگے بڑھایا تھا لیکن روی نے آہستگی سے ان کا ہاتھ پیچھے کردیا اور اماں جو زمین پر گری ٹرالی سیدھا کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تھیں انہیں ایک ہاتھ سے اپنے پیچھے کیا اور خود جیسے ڈھال بن کر ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"میں۔" وہ دہاڑے تھے۔ "میرے جیسا وجیہہ اور خوب صورت مرد اتنا اعلیٰ تعلیم یافتہ اس عورت کے قابل نہیں تھا۔" انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"تمہارا دماغ اس عورت نے خراب کردیا ہے روی! ورنہ تم اس بات پر فخر کرتے کہ تمہارا باپ دنیا کا خوب صورت ترین اور بہترین شخص ہے۔" روی نے ایک گہری سانس لی تھی۔

"اور مجھے لگتا ہے جیسے میرا باپ دنیا کا بدترین مرد ہے۔ خوب صورت وہ نہیں ہوتا ابا جی جس کا ظاہر خوب صورت ہو اصل خوب صورت وہ ہوتا ہے جس کا اندر بھی خوب صورت ہو۔" وہ اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا تھا اور حبیب خان وہیں کھڑے تلملاتے رہے۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے نازو کو آواز دی تھی۔

"نازو، یہ سب سمیٹ لو۔" اور نازو تو جیسے کہیں آس پاس ہی کھڑی ہوئی تھی کہ یک دم لاؤنج میں آگئی۔

اس رات اس نے اماں کو اپنے کمرے میں جانے نہیں دیا تھا۔ وہ جانتا تھا رات اگر اماں اپنے کمرے میں اکیلی ہوئیں تو ابا نے انہیں اذیت دینی ہے۔

"تم ایسا کیوں کرتے ہو روی...... وہ تمہارے باپ ہیں۔" آنے والے کسی لمحے کے خوف سے... تھر تھر کانپتے ہوئے انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"ہاں، مجھے اس رشتے کا احترام ہے لیکن میں انہیں آپ پر ظلم کرنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی میں یہ سب دیکھ رہا ہوں اماں جی لیکن اب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔"

"پر بیٹا اس طرح ان کا غصہ اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ......"

"آج تک انہیں کسی نے ایسا کرنے سے منع نہیں کیا۔ دادا جان اور دادی جان یہاں نہیں تھے، وہ اپنی من مانی کرتے رہے لیکن اب میں انہیں من مانی نہیں کرنے دوں گا۔ میں روز روز آپ کی عزتِ نفس مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتا اماں جی۔ ابا جی کو خود کو بدلنا ہوگا۔" لیکن شاید اس سے وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ انہیں بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

اس رات اماں اور گڑیا اس کے بیڈ پر سوئی تھیں اور وہ کارپٹ پر تکیہ رکھ کر سو گیا تھا۔ رات کو اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی وہ پانی پینے کے لیے اٹھا تو نائٹ بلب کی روشنی میں اس کی نظر اماں کے بازو پر پڑی تھی۔ وہ گڑیا کے گرد بازو رکھے گہری نیند سو رہی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر ساکت کھڑا ان کے بازو کو دیکھتا رہا تھا۔ جگہ جگہ پڑے ہوئے نیل۔ اور پھر بازو پر سے ہوتی اس کی نگاہ ذرا کی ذرا اماں کی گردن پر پڑی تھی۔ وہاں بھی کئی ایسے ہی نیل تھے۔ وہ سارا دن فل آستین کی قمیص پہنے اچھی طرح دوپٹا اپنے گرد لپیٹے رکھتی تھیں۔

"نہیں۔" اس نے نظریں ان پر سے ہٹالی تھیں اور پھر وہ پوری رات نہیں سو سکا تھا۔ ایک بار پھر اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اماں کو بہت جلد اس

محبت خانے سے لے جائے گا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے۔ اس رات اس نے کارپٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل بنایا تھا۔ ابھی وہ فرسٹ ائیر میں تھا۔ اماں سچ کہتی تھیں اس کا غصہ اور ابا سے بحث اماں کے لیے زندگی کو مزید مشکل بنا رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ اب ان سے کچھ نہیں کہے گا لیکن اماں اور گڑیا کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھے گا۔ وہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا اور اس نے اگلے دو سالوں میں ایسا ہی کیا تھا۔

وہ کالج سے آتے ہی اماں کے ساتھ ساتھ رہنے لگا تھا خاص طور پر جب ابا گھر پر ہوتے۔ وہ گڑیا کو ڈھیروں کہانیاں سناتا۔ اس کا ہوم ورک کرواتا، اسے گھمانے لے جاتا، اس کے لیے اپنے جیب خرچ سے ڈھیروں چیزیں لاتا۔ اماں کے لیے شاپنگ کرتا، خوب صورت زمانے کے مطابق ڈریس خریدتا، سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی اس کی سوچ ایک میچور شخص کی سی تھی۔

"میں آرمی جوائن کروں گا۔" اس نے اماں کو بتایا۔ "میری ٹریننگ کے چند سال آپ تنہا ہوں گی یہاں —— آپ کو اپنا اور گڑیا کا خود خیال رکھنا ہے۔ پھر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔" یہ اس کا فیصلہ تھا۔

وہ اماں کا سایہ بنا ہوا تھا پھر بھی ابا کو کسی نہ کسی وقت اماں پر ہاتھ اٹھانے اور چیخنے چلانے کا موقع مل ہی جاتا تھا۔ اس نے کئی بار اماں کی پیشانی پر گومڑ ابھرا دیکھا تھا اور نظر انداز کیا تھا۔ کئی بار ان کے رخساروں پر انگلیوں کے نشان ثبت دیکھے تھے اور دل خون کے آنسو رویا تھا لیکن اس نے ابا سے باز پرس کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی باز پرس اماں کو مزید اذیت دیتی ہے۔ اس روز جب وہ اپنا ایف ایس سی کا آخری پریکٹیکل دے کر گھر آیا تو ابا کی دہاڑ لاؤنج سے باہر تک آ رہی تھی اور نازو لاؤنج کی دیوار کے پاس کھڑی سسک رہی تھی۔ نازو پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر وہ تیزی سے لاؤنج کی طرف بڑھا۔ اماں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

"میں...... مجھے کچھ علم نہیں۔" روحی وہیں ساکت کھڑا ہو گیا۔

"بکواس کرتی ہے، وہ بڈھا ساری جائداد میرے نام لکھ گیا۔ گاؤں کی ساری زمینیں، حویلی، سرگودھا کے مربعے سب کچھ اور تو کہتی ہے تجھے علم نہیں۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پشاوری جوتا ان کی پیٹھ پر مارا تو وہ جو بت بنا کھڑا تھا تڑپ کر آگے بڑھا۔

"ابا جی——!" وہ زور سے بولا۔ "خبردار اب اگر میری ماں کو ہاتھ لگایا تو۔"

"تو——" انہوں نے مڑ کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور ایک لات اماں کو ماری۔ اماں لڑکھڑائی تھیں۔ روحی نے تیر کی طرح آگے بڑھ کر انہیں اپنے بازوؤں میں سنبھالا لیکن وہ بھربھری مٹی کی طرح اس کے بازوؤں میں ڈھیر ہو گئی تھیں۔

"اماں جی—— اماں جی۔" اس نے انہیں آرام سے صوفے پر لٹاتے ہوئے پکارا تھا۔ ہولے ہولے ان کے رخساروں کو تھپتھپایا پھر ان کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اسے لگا جیسے ان کی نبض ڈوب رہی تھی اور ایک خوفناک سی ٹھنڈک پورے وجود میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

"میری ماں کو اگر کچھ ہو گیا تو میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے روتے ہوئے چیخ کر کہا اور پھر دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھائے تیزی سے لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے اس نے نازو سے گاڑی کی چابی لانے کو کہا اور خود تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

ناولٹ

کوئی شہر ایسا بساؤ من میں

نگہت سیما

دوسرا حصہ

''اور پتا ہے مروان، یہ جو میراں اماں ہیں نا ان کا نام امیر خاتون ہے لیکن پتا نہیں کیوں سب انہیں میراں اماں کہتے ہیں۔ شاید بچپن میں انہیں میراں کہتے ہوں گے اور جب وہ ماں کے عہدے پر فائز ہوئی ہوں گی تو میراں اماں ہوگئی ہوں گی۔ میراں اماں تو جیسے محبت کے خمیر سے گندھی ہوئی ہیں۔ جب سے یہاں آئی ہیں سب محلے والوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہیں اور تو اور اماں جی بھی ان کی باتیں بڑے دھیان سے سنتی ہیں۔ وہ جب بھی آتی ہیں اماں کی آنکھوں سے خوشی جھلکنے لگتی ہے۔ پر مروان ان کے گھر کے پورے سترہ بندے ایک دن میں ختم ہوگئے۔ میراں اماں کا بہت بڑا گھر تھا ڈاما ڈولا میں جہاں ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ دیور اور جیٹھ کا خاندان بھی ساتھ تھا۔ بیٹیاں جیٹھ اور دیور کے گھر بیاہی تھیں۔ یہ جنوری 2006 کی صبح تھی۔ جب اچانک ان کے گاؤں پر راکٹ آکر گرا۔''

یکدم سیمل چونکی، اسے لگا جیسے اماں کراہ رہی ہوں۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ اماں اپنا گھٹنا پکڑے زمین پر بیٹھی ہولے ہولے کراہ رہی تھیں۔

''کیا ہوا اماں جی؟'' وہ گھبرا کر ان کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے پلنگ کے پائے کی طرف اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئی۔ اماں شاید واش روم... گئی تھیں اور باہر آتے ہوئے وہ پلنگ کے پائے سے ٹکرا گئی تھیں۔ اماں کے ساتھ پچھلے سات آٹھ بلکہ نو سالوں سے یہ مسئلہ بھی تھا کہ وہ کبھی یوں ہی ناک کی سیدھ میں چلتی رہتی تھیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ سامنے کوئی چیز ہے۔ اس نے جلدی جلدی ان کی شلوار کا پائنچہ اوپر کیا۔ گھٹنے سے نیچے ٹانگ پر نیل سا پڑ چکا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اسے رگڑا پھر دوڑ کر آیوڈیکس لے آئی اور نرم ہاتھوں سے آیوڈیکس لگا کر انہیں سہارا دے کر اٹھایا۔

''اٹھیں نا اماں جی...'' ان کے چہرے پر اذیت تھی، لب ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

''اماں جی...'' اس کا دل چاہا وہ ان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگے۔ یہ اس کی اتنی بہادر اور صابر اماں تھیں جنہوں نے اس سے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کی تھیں لیکن اب... بہت محبت سے انہیں بیڈ پر بٹھاتے ہوئے اس نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔ کیسے خوب صورت ہاتھ تھے اماں کے، وہ کتنی ہی دیر انہیں ہاتھوں میں لیے بیٹھی رہی۔ اماں بالکل چپ بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں ان کی آنکھوں میں نمی سی تھی لیکن وہ رو نہیں رہی تھیں۔ وہ روتی نہیں تھیں البتہ ان کے چہرے اور آنکھوں سے اذیت کا احساس ہوتا تھا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہوں۔

''اب درد تو نہیں ہو رہا اماں جی؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

آج اتوار تھا اسے یونیورسٹی نہیں جانا تھا۔ وہ اماں کو ناشتا کروا کے باہر صحن میں بیٹھی تھی۔ اماں ناشتا کر کے لیٹ گئی تھیں، وہ عموماً ناشتا کر کے سو جاتی تھیں۔

"آپ مجھے آواز دے لیتیں اماں جی۔ آج فضیلت آجائے تو میں یہ بیڈ ذرا سا پیچھے کروا دیتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں کی نظریں اس کی طرف تھیں۔ سوال کرتی التجا کرتی۔

"ابھی آتی ہوں اماں..... وہ میں مروان کو بتا رہی تھی میران اماں کے متعلق۔"

مروان کے نام پر اماں کی آنکھیں یکدم سپاٹ ہوگئی تھیں۔ یوں جیسے وہ .... اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہوگئی ہوں۔

"بس ابھی آئی اماں جی۔" اس نے انہیں حال میں واپس لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن اب وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں بلکہ سامنے دیوار پر نظریں جمائے پتا نہیں کس منظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہ افسردہ سی صحن میں آگئی اور تخت پر پڑا اپنا موبائل، ڈائری اور قلم اٹھایا۔ موبائل کی اسکرین روشن تھی اس نے بغیر نمبر دیکھے فون آف کیا اور افسردہ افسردہ سی اماں کے پاس آگئی۔ اماں اب لیٹ چکی تھیں اور ان کی آنکھیں چھت پر نہ جانے کیا تلاش کررہی تھیں۔

"پتا نہیں اماں کب اپنی زندگی کی طرف لوٹیں گی اور اماں کو کیا پتا کہ ان کی یہ چپ مجھے اندر ہی اندر ہولے ہولے مارے جارہی ہے۔ میں کتنا ترس گئی ہوں ان کے لیے حالانکہ اماں میرے پاس ہیں۔" وہ ان کی پائنتی بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگی لیکن ان کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی وہ ویسے ہی سیدھی لیٹی اوپر چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ وہ ان کی ٹانگیں دباتی ان کی طرف پرامید نظروں سے دیکھتی رہی شاید وہ اس سے کہیں۔

"بس کرو بیٹا تھک جاؤ گی۔" شاید وہ کچھ نہ کہیں لیکن اپنی ٹانگیں کھینچ لیں، اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھیں جیسے منع کررہی ہوں لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور وہ یونہی چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے سوگئیں۔ وہ آنکھوں میں آنے والی نمی کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

فضیلت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اتوار کو وہ دیر سے آتی تھی لیکن آج کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی تھی اس نے سامنے کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو رہے تھے اور اسے ڈاکٹر عرفان کی طرف جانا تھا اماں کی دوائیاں بھی ختم ہورہی تھیں اور اسے ڈاکٹر عرفان سے یہ بھی کہنا تھا کہ وہ اماں کی دوائیاں کچھ کم کردیں۔ ان دوائیوں سے اماں کو بہت نیند آتی تھی بعض اوقات تو وہ بیٹھے بیٹھے سو جاتی تھیں اور ان کی طویل نیند سے اسے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی، خوف آنے لگتا تھا۔ اماں جاگ رہی ہوتیں تو جیسے سارے خوف ساری گھبراہٹ آپ ہی آپ ختم ہوجاتی تھی اماں بھلے چپ رہتی تھیں لیکن ان کے جاگنے سے پورے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اماں کندھوں تک چادر ڈال کر وہ باہر نکل آئی۔ دھوپ کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ پورے صحن میں موتیے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے موتیے کے پھول توڑے اور اماں کے تکیے کے پاس رکھ دیے..... اماں کو موتیا بہت پسند تھا اماں جب ٹھیک تھیں تو وہ موتیے کے پھول اپنے کانوں میں ڈالتی تھیں اور گجرا سا بنا کر کلائی پر لپیٹ لیتی تھیں۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اماں کہتی تھی کہ اس کے کانوں میں بھی موتیے کے بالے ڈالیں لیکن اس کے کانوں میں اتنے بڑے بڑے سوراخ نہ تھے جن میں موتیے کے پھول کی ڈنڈی چلی جاتی۔

"اماں آپ نے اتنے بڑے بڑے چھید کروائے ہیں اور میرے چھوٹے چھوٹے۔"

"یہ خود ہی بڑے ہوگئے ہیں بھاری جھمکے پہننے سے، تمہاری دادی اماں نے مجھے بہت بھاری زیور پہنایا تھا۔ اور جتنا عرصہ میں گاؤں میں رہی ماں جی مجھے جھمکے اور چوڑیاں نہیں اتارنے دیتی تھیں۔ نئی بیاہی دلہنیں خالی کان خالی گلے کے ساتھ اچھی نہیں لگتیں۔ بس وہ بھاری جھمکے پہننے سے چھید بڑے ہوگئے تھے۔" اور اماں کے کانوں میں تین چھید تھے۔ اور اب تو اماں کسی کسی ہیرے کے چھوٹے چھوٹے نگوں والے ٹاپس پہنتی تھیں یا پھر صبح صبح موتیے کے پھول کانوں میں اڑس لیتی تھیں وہ ٹاپس اور اماں کا سارا زیور تو وہیں رہ گیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ آہستگی سے بھیڑ کر باہر آگئی۔ باہر کے دروازے پر دستک ہورہی تھی۔

"او فضیلت آگئی۔" وہ خوش ہوگئی۔ فضیلت کو سارا کام سمجھا کر جب وہ گھر سے نکلی تو ساڑھے دس بج رہے تھے اور دھوپ چبھ رہی تھی۔ جون کی تین تاریخ تھی اور دس بجے ہی سورج آگ برسا رہا تھا۔ اگر فضیلت جلدی آجاتی تو وہ سویرے سویرے ہی اپنے کام نپٹا لیتی۔ چادر کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے یکدم ہی تنگ گلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ یہاں اس گلی میں دھوپ براہ راست نہیں پڑتی تھی۔ اونچی چھتوں والے مکانوں کے شیڈز اور گیلریوں سے گلی سایہ دار تھی۔ اسے لگا جیسے وہ یکدم کھلے میدان سے کسی سایہ دار جگہ پر آگئی ہو۔ یہ راستہ تھوڑا لمبا تھا لیکن وہ براہ راست دھوپ سے تو بچ جاتی۔ وہ سکون کی سانس لیتے ہوئے اماں کے متعلق سوچتے ہوئے چل رہی تھی کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور اندر سے نوشیرواں عادل نے باہر قدم رکھا۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت اتری تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رکی اور پھر اس نے قدم آگے بڑھا دیے لیکن نوشیرواں لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا اور اب اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ تنگ گلی میں دونوں کے درمیان بس دو ہاتھ کا فاصلہ ہی تھا۔

"آپ کہاں جارہی ہیں؟"

"ڈاکٹر عرفان کے کلینک۔" اس نے نوشیرواں کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اماں کی دوائیاں ختم ہوگئی تھیں اور پھر انہیں اماں کی طبیعت کا بھی بتانا تھا۔"

"آپ مجھے کہہ دیتیں، لا دیتا مجھے دیں اماں کا نسخہ۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن یمل بدستور چلتی رہی۔

"نہیں، مجھے ان سے اماں کے متعلق تفصیلی بات بھی کرنی ہے۔"

"کیوں کیا ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

"نہیں بلکہ مجھے لگ رہا ہے کہ وہ کچھ improve کررہی ہیں۔"

"گڈ......" وہ مسکرایا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟" اسے مسلسل ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر یمل نے پوچھا۔

"آپ کے ساتھ جارہا ہوں کلینک..... میں یہاں آیا تھا حیدر کے گھر، پیچھے حیدر کا گھر ہے۔ میرا بیٹ مین تھا۔" وہ ذرا سا چونکی۔ اس کا خیال صحیح تھا نوشیرواں کا تعلق فوج سے ہی تھا۔ وہ نیچے زمین کی طرف دیکھتی چل رہی تھی۔ اس کی نظریں نوشیرواں کے پاؤں پر پڑی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر غور کیا وہ ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کلینک نہ جائے وہ اکیلی جاسکتی ہے اور پہلے بھی تو اکیلی ہی جاتی رہی ہے۔

ساری گلیاں اب برسوں سے اس کی جانی پہچانی تھیں۔ اب یہاں چلتے ہوئے اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ یہاں آس پاس سب اچھے اور ملنسار لوگ رہتے تھے حالانکہ شروع شروع میں..... وہ بہت ڈرتی تھی اور سارے رستے..... آیت الکرسی پڑھتی جاتی تھی تب بھی تو اکیلے ہی جاتی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ گلی سنسان تھی۔ کبھی کبھار کسی گھر کا دروازہ کھلتا اور اندر سے کوئی عورت یا بچہ نکل کر کسی سمت چلا جاتا۔ اس کے قدموں کی رفتار ذرا دیر کو مدھم ہوئی وہ رک کر اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ تکلیف نہ کرے اسے کوئی ڈر نہیں ہے لیکن جب اس نے نوشیرواں عادل کی طرف دیکھا تو وہ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں یمل بی بی۔ میں

آپ کے ساتھ جا رہا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں آپ کو میرے ساتھ کی ضرورت نہیں۔" وہ چپ کر گئی۔ وہ کسی کے سامنے یونہی لاجواب ہو جایا کرتی تھی اور مروان کہتا تھا۔

"جو تمہارے دل ہوتا ہے کہا کرو..... کسی کی غلط بات پر چپ نہ ہو جایا کرو بلکہ تردید کیا کرو، دلیلوں سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا کرو۔"

اب پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس کا یوں ساتھ ساتھ چلنا پتا نہیں اسے اچھا لگ رہا تھا یا نہیں لیکن ایک تحفظ کا احساس ہو رہا تھا جیسے مروان کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ چلتے چلتے روڈ پر آ گئے تھے۔ نوشیرواں نے پھر کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی سیمل نے کچھ کہا تھا حالانکہ کتنی بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس سے گل کے متعلق پوچھے۔ وہ اسلام آباد گیا تھا۔ کیا اسے گل کا کچھ پتا چلا۔ اس نے سنا تھا کہ اسلام آباد میں ایک آفس ہے لاپتا افراد کے متعلق پتا چل جاتا ہے۔ حمنہ نے اسے بتایا تھا پتا نہیں صحیح تھا یا غلط۔ حمنہ کے ایک دور کے عزیز جو راولپنڈی میں رہتے تھے وہ بھی عین ان کی بیٹی کی شادی والے دن گھر سے غائب ہو گئے تھے اور ابھی تک ان کے متعلق کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ وہ کہاں ہیں، زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ ان کا بیٹا بھاگ، بھاگ کر تھک گیا تھا۔ کبھی کسی دفتر میں کبھی کسی دفتر میں لیکن کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور حمنہ کو ہی کسی نے بتایا تھا کہ اسلام آباد میں کسی سوشل ورکر نے آفس کھولا ہے وہ پتا کروا دیتا ہے۔ شاید نوشیرواں کو بھی کسی نے اس آفس کا بتایا ہو اور شاید اس سوشل ورکر نے اسے بتا دیا ہو کہ گل کہاں ہے اور میری اماں کتنی خوش ہوں گی۔ اس نے سڑک عبور کرنے کے انتظار میں کھڑے کھڑے نوشیرواں کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کیا پوچھنا ہے سیم..... پوچھ لیں۔" اس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی تھی اور سیمل نے جھنجلا کر سوچا تھا۔

"اُفوہ..... یہ نوشیرواں عادل ہے یا نوشیرواں نجومی پتا نہیں کیسے دل میں سوچی گئی بات بھی جان لیتا ہے۔ نوشیرواں نجومی" اس نے دُہرایا اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

نوشیرواں نجومی..... آیئے دل کا حال معلوم کیجیے۔ قسمت کا احوال جانیے اور پیش بندی کے لیے..... دیواروں پر لکھے اشتہار اس کی آنکھوں کے سامنے آئے تو اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اگر وہ یہاں سڑک پر نوشیرواں کے ساتھ نہ کھڑی ہوتی تو کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ آنکھوں کے سامنے جگہ جگہ دیواروں پر لکھا نوشیرواں نجومی..... ملک کے ماہر ستارہ شناس آ رہا تھا اور نوشیرواں کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔ لبوں پر کھلتی مسکراہٹ نے تپتی دھوپ میں گلستان مہکا دیے تھے۔ وہ ایک وارفتگی کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ لڑکی خوب صورت ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اس کی مسکراہٹ اتنی ظالم ہے اس کا اندازہ مجھے ہرگز نہیں تھا۔" اس نے سیمل پر سے نظریں ہٹا کر سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ ٹریفک رک گیا تھا۔

"آیئے....." اس نے جیسے اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا پھر ہاتھ نیچے کر لیا۔ سیمل نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سڑک عبور کی۔ کچھ آگے جا کر وہ ایک گلی میں مڑ گئے تھے۔ دو گلیاں آگے جا کر پھر ایک سڑک تھی جس پر ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ ریسپشن پر اماں کی فائل دے کر وہ ویٹنگ روم میں آئے تھے وہاں صرف تین مریض تھے۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے حسبِ عادت چادر کے پلو سے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور نوشیرواں عادل کو دیکھنا چاہا تو وہ اسی صوفے پر بیٹھا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے آہستگی سے کہا۔

"اگر آپ فیصلہ کر چکی ہوں تو پوچھ لیں کیا

پوچھنا ہے۔" لمحے بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت اتری تھی اور پھر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"گل..... مجھے گل بھائی کے متعلق پوچھنا تھا۔"

"گل..... گل بھائی..... ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

"کچھ پتا چلا ان کا۔" اب وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔ یکایک اس کی آنکھوں سے گہرا حزن جھانکنے لگا تھا اور چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ حمنہ..... میری دوست ہے نا وہ کہہ رہی تھی کہ وہاں اسلام آباد میں ایک شخص تھا....."

"سب فراڈ تھا۔" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انسانی لاشوں پر بھی اپنی سوداگری چمکا لیتے ہیں۔ وہ بھی کوئی ایسا ہی شخص تھا۔ انسانی لاشوں کا کاروبار کرنے والا۔" اس نے تنفر سے ہونٹ سکیڑے۔

"لوگوں کے جذبات سے کھیل کر ان کی مجبوریاں خریدنے والا۔ آپ کو پتا ہے سیم مجھے وہاں ایک خاتون ملی تھیں۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اس کے شوہر کو لاپتا ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا سارا زیور فروخت کر دیا تھا اور اس شخص نے اس سے دو لاکھ لیے تھے۔ اس کے شوہر کے متعلق خبر دینے کے عوض..... کاش میں ایسے لوگوں کو سولی پر لٹکانے کا اختیار رکھتا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"مجھے وہ مل جاتا تو میں اسے نہ چھوڑتا۔" اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"تو آپ....."

"میں جی۔ ایچ۔ کیو گیا تھا۔ میرے ایک بہت مہربان ہیں بریگیڈیر مصطفیٰ ان سے التجا کرنے کہ وہ گل کی تلاش میں میری مدد کریں۔ اماں جان ساری ساری رات سجدے میں گر گر رو رو کر اس کی واپسی کی دعا مانگتی ہیں۔ مجھ سے اماں جان کا رونا نہیں دیکھا جاتا سیمل ورنہ جہاں میں نے سب پر صبر کر لیا تھا اس پر بھی صبر کر لیتا۔" سیمل کی آنکھیں جیسے بہنے کو بے تاب ہو رہی تھیں لیکن وہ ہونٹ بھینچے نوشیرواں عادل کو سن رہی تھی۔

"آپ کو اماں جان نے گل کے متعلق بتایا کچھ۔"

"نہیں....." سیمل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"گل بہت پیارا تھا، بہت نازک۔ لڑکیوں ایسا حسن تھا اس کا۔ بچپن میں ہم سب اسے چھیڑتے تھے کہ اللہ میاں نے غلطی سے اسے لڑکا بنا دیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکیوں کی طرح رو پڑتا تھا۔ وہ میرے بڑے ماموں کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی تین بہنیں تھیں۔ وہ سب کا لاڈلا تھا۔ سب اس کا یوں خیال رکھتے جیسے وہ کوئی کانچ کا گڈا ہو، ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جائے گا۔ اماں جان تو صبح شام اس پر نظر کی دعا پڑھ کر پھونکا کرتی تھیں۔ پتا ہے سیم اس کا دل تو چڑیا جتنا تھا۔ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر کر مر جاتا تو وہ گھنٹوں روتا رہتا۔ بلی یا کتے کے بچے کو شریر بچے رسی باندھ کر گلی میں گھسیٹتے تو وہ ان سے لڑ پڑتا کہ یہ ظلم ہے..... اور پھر اس ظلم پر آنسوؤں سے روتا اور کئی دنوں تک اداس رہتا تھا۔ گلی میں کسی فقیر کو دیکھتا تو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ یہ بھیک کیوں مانگ رہا ہے۔ اس کے کپڑے اچھے نہیں ہیں۔ اس کے بچوں کو کھانا کون دیتا ہے۔ وہ اماں جان کو اپنے سوالوں سے زچ کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی اماں جان جھنجلا جاتیں۔

وہ جنوری کا مہینہ تھا جب ہم یکایک بھرے پُرے خاندان سے محروم ہو گئے تھے۔ اور اگست میں ہم بچ جانے والے تین افراد میں سے ایک اور کم ہو گیا تھا۔" وہ جیسے تھک کر چپ ہوا تھا اور سیمل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے تسلی دے۔ ایسے زخم بھلا تسلی کے چند لفظوں سے بھرتے ہیں۔ یہ تو سدا رِستے رہتے ہیں ہمیشہ تر و تازہ رہتے ہیں۔ وہ جیسے بے بس سی ہو کر چپ کر گئی تھی تب وہ ہولے سے کھنکھارا تھا۔

"تم کچھ بھی نہ کہو...... کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ صرف میرا یا میرے خاندان کا دکھ نہیں ہے۔ ہم تو جیسے اب خود کو پرسا دیتے ہیں اور خود ہی تسلی کے لفظ اپنے اندر انڈیل لیتے ہیں۔" وہ پھر جیسے اس کے دل کی بات جان گیا تھا۔ یسمل حیران ہوئے بغیر اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماحول کا تناؤ دور کرنے کے لیے وہ مسکرایا۔

"آپ کے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں" یسمل نے یک دم اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ تب ہی ریسپشن پر کھڑی لڑکی اندر آئی۔

"مس یسمل......"

"جی......" اس نے اندر جانے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یسمل اٹھی تو نوشیرواں بھی اٹھ گیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کلینک میں آئے تھے۔ ڈاکٹر عرفان نے اس کے پیچھے آتے نوشیرواں کو دیکھا تو یک دم ہی اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور میز کے پیچھے سے نکل کر انتہائی گرم جوشی سے اسے گلے لگایا۔

"یہ تم ہی ہو نا میجر نوشیرواں آج ہماری یاد کیسے آ گئی۔ خواب تو نہیں دیکھ رہا میں۔" نوشیرواں مسکرایا تھا۔

"بس یار میں پچھلے ایک سال سے کم کم ہی ادھر آیا ہوں لاہور۔"

"اور اماں جان......؟" ڈاکٹر عرفان پوچھ رہا تھا۔

"جب اُدھر تھا گلبرگ میں تو ایک مستقل ملازمہ تھی ان کے پاس اور اب یہاں سمن آباد میں حیدر کا گھر ہے نا پاس ہی تو جب میں نہیں ہوتا گھر پر تو اس کے گھر سے کوئی آ جاتا ہے ان کے پاس۔" یسمل کو اپنی بے خبری پر ندامت ہوئی۔ اسے تو کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ میراں اماں گھر پر بالکل اکیلی ہوتی ہیں۔

"سمن آباد میں تم کہاں رہ رہے ہو؟" ڈاکٹر عرفان واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

"ان کا پڑوسی ہوں۔" نوشیرواں نے مڑ کر اسے دیکھا اور تب پہلی بار ڈاکٹر عرفان اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ارے یسمل بی بی کیسی ہیں آپ اور آنٹی کا کیا حال ہے؟" اور جب وہ اماں کے متعلق تفصیل بتا رہی تھی تو نوشیرواں بھی درمیان میں تھے دیتا جا رہا تھا اور اس رات کی اماں کی حالت اس نے تفصیل سے بتائی تھی اور یسمل چپ ہو گئی تھی۔ وہ اماں کے متعلق ہر بات یوں ڈاکٹر عرفان سے ڈسکس کر رہا تھا جیسے مروان کرتا تھا۔

"اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے بندوں کو نہیں بھولتا۔" ایک بار مروان نے کہا تھا۔ "وہ ہماری بھی ضرور سنے گا۔"

ڈاکٹر عرفان بہت پُر امید تھے۔ اماں کے متعلق اس ایک ماہ میں وہ کب ہنسی تھیں، کب انہوں نے کوئی بات کی تھی۔ یسمل نے ایک ایک بات تفصیل سے بتائی تھی۔

"یہ بہت خوش آئند ہے یسمل بی بی۔ مجھے یقین ہے کہ آنٹی اب جلد واپس اپنی نارمل حالت میں آ جائیں گی۔" انہوں نے کچھ دوا میں تبدیلی کی تھی اور یسمل جب نوشیرواں کے ساتھ کلینک سے باہر نکلی تو اتنی خوش تھی کہ اس نے نوشیرواں کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ جب وہ کلینک میں داخل ہو رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ واپس جاتے ہوئے وہ نوشیرواں کو صاف صاف منع کر دے گی کہ خوامخواہ اس کی عادتیں خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ تنہا مشکلوں سے تو اس نے تنہا جینا سیکھا تھا مروان کے بغیر لیکن واپس جاتے ہوئے وہ صرف اماں کے متعلق سوچ رہی تھی اور مروان کے متعلق ....

"کیا سوچ رہی ہیں؟" سڑک کے کنارے کھڑے نوشیرواں نے پوچھا تھا۔

"میں سوچ رہی ہوں مروان کو جب پتا چلے گا کہ اماں بہتر ہو رہی ہیں تو وہ کتنا خوش ہو گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" نوشیرواں مسکرایا تھا اور اس نے ماتھے پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ سڑک کے دوسری طرف کھڑی خواتین میں سے ایک لڑکی پر اسے حنہ کا گمان گزرا تھا۔ دوسری طرف کھڑی لڑکی تو نہ جانے کون تھی لیکن سیاہ ہنڈا سٹی میں سے جھانکتے شخص سے نظر ملتے ہی وہ ڈر کر پیچھے ہٹی تھی۔ اس کا رنگ یکدم زرد ہو گیا تھا۔ سڑک پر گاڑیاں اشارے پر رکی ہوئی تھیں۔ اسے لگا سیاہ ہنڈا سٹی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص فرنٹ ڈور کھول رہا ہے۔ لیکن اشارہ کھل گیا تھا اور یکدم بہت ساری گاڑیوں کے ہارن بج اٹھے تھے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی لیکن خوفزدہ نظروں سے اُدھر ہی دیکھتے ہوئے اسے لگا جیسے گاڑی یوٹرن سے مڑ کر واپس آ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر سڑک پر ڈالی اور پھر مڑ کر دوڑ لگا دی۔ وہ سامنے والی گلی میں گھس گئی تھی۔ نوشیرواں نے ایک لمحے رک کر اسے خوف زدہ ہو کر دوڑتے دیکھا تھا اور پھر خود بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پیچھے گلی میں گھس گیا۔

☆☆☆

دو دن رہ کر اماں اسپتال سے گھر آ گئی تھیں ان دو دنوں میں ابا ایک بار بھی اسپتال نہیں آئے تھے۔ اکیلا روحی تھا جو اماں کے پاس تھا اور اسے گڑیا کی بھی فکر تھی جو گھر میں اکیلی تھی۔ اگرچہ وہ دو تین چکر گھر کے لگا آتا تھا۔ نزہ کو بھی سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ گڑیا کا خیال رکھے پھر بھی دو دنوں میں گڑیا کا ذرا سا منہ نکل آیا تھا۔ ابا کو اپنے پوجا سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ گڑیا یا کسی اور طرف دھیان دیتے۔ ڈاکٹر نے روحی سے پوچھا تھا۔

"تمہارے گھر میں کوئی بڑا نہیں ہے بیٹا؟ تمہارے والد یا کوئی اور..."

"نہیں۔" روحی نے جھجکتے سے اماں کو دیکھا تھا۔ نرس ان کا بی پی چیک کر رہی تھی۔

"میرے والد گھر پر نہیں ہیں۔ دادا کا انتقال ہو چکا ہے اور گھر میں بس چھوٹی بہن ہے۔" ڈاکٹر خاصا ہمدرد تھا اور نرسیں بھی اچھی تھیں۔ شام کو جب وہ گڑیا کو لاتا اماں سے ملانے تو ڈیوٹی پر موجود نرسیں اسے بہت پیار کرتیں جب وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر اماں کے لیے دعا کرتی تو اس پر بے ساختہ پیار آتا تھا پھر ڈاکٹر نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔

"خون کی شدید کمی ہے اور کمزوری بھی بہت ہے۔ لگتا ہے یہ کچھ کھاتی پیتی نہیں ہیں۔ ان کی ڈائٹ کا خیال رکھا کریں۔" ڈاکٹر نے تاکید کی۔

گھر میں سب کچھ وافر تھا لیکن شاید اماں کی بھوک ہی مر گئی تھی۔ گھر آنے کے بعد روی اماں کی خوراک کا بھی خود خیال رکھنے لگا تھا۔ ابا نے احوال تک نہ پوچھا۔

"آپ اسپتال نہیں آئے؟" روی نے گلہ کیا۔

"میں نے کیا کرنا تھا وہاں آکر، تم تھے نا اپنی ماں کی دیکھ بھال کے لیے۔" روی کو افسوس ہوا تھا کہ اس نے ان سے کیوں کہا۔ حالانکہ وہ ابا سے کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا پھر بھی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔

روی کی زندگی اب گڑیا اور اماں کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس نے ابا کی طرف دیکھنا اور خود سے ان سے بات کرنا چھوڑ دیا اور ابا خود سے کبھی کوئی بات کرتے تو وہ جواب دے دیتا تھا اور ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ ابا اس سے بات کریں۔

آج کل وہ فارغ تھا اس لیے اس کا سارا وقت اماں اور گڑیا کے ساتھ گزر رہا تھا۔ گڑیا کو خود اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا، گھر آتا تو اماں کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ وہ کچن میں ہوتیں تو وہ پاس کھڑا ان سے باتیں کر رہا ہوتا۔ لاؤنج میں آتیں تو ان کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈراموں پر تبصرہ کرتا۔

ان دنوں اماں کی صحت اچھی ہو گئی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ خود ان کے کمرے میں دودھ کا گلاس لے کر جاتا اور جب تک وہ پی نہ لیتیں نہ اٹھتا پھر گڑیا کو کہانی سناتا۔ گڑیا کہانی سنے بغیر سوتی ہی نہ تھی۔ اس کی اپنی دلچسپیاں بالکل محدود ہو کر رہ گئی تھیں لیکن وہ خوش تھا۔

ابا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کھانے کی میز پر، لاؤنج میں کہیں بھی وہ طنز کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ انہوں نے کبھی گڑیا یا روی کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھی معمولی بات پر پہلے کی طرح ہی آپے سے باہر ہو جاتے پھر چیزوں کی شامت آ جاتی تھی لیکن روی کی موجودگی میں وہ ان پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

اس روز وہ اماں کے پاس بیٹھا انہیں اپنے ایک دوست کے متعلق بتا رہا تھا اور اماں پالک کاٹ رہی تھیں کہ اچانک ہی وکیل کا فون آ گیا۔ وہ اماں سے بات کرنا چاہتے تھے۔ تب اسے یاد آیا کہ اس روز جب اماں بے ہوش ہوئی تھیں تو جھگڑا اماں کے نام کی جائداد پر ہوا تھا۔ اماں بات کر چکیں تو اس نے تفصیل پوچھی تب اماں نے بتایا۔

"ماموں جان نے اپنی تمام پراپرٹی اور بینک میں موجود رقم میرے نام کی ہے کیونکہ میں ان کی وارث ہوں شرعاً اور قانوناً۔ وکیل نے مجھے یہی بتایا ہے۔ تمہارے ابا کے نام کچھ نہیں ہے سوائے اس کوٹھی کے جس میں وہ رہ رہے ہیں۔"

"وکیل نے اب آپ کو کیوں فون کیا ہے؟" اماں جھجک گئیں۔

"وہ پوچھ رہا تھا کہ کیا میں نے تمہارے ابا کو کوئی مختار نامہ دیا ہے۔"

"آپ نے کیا کہا؟" روی اماں کی کمزوری جانتا تھا۔ وہ جھگڑے اور ابا کے غصے سے بہت گھبراتی تھیں۔

"وہ...... وکیل نے مجھے ملنے کو کہا ہے۔"

"ابا یقیناً کوئی فراڈ کر رہے ہیں تب ہی اتنے دنوں سے انہوں نے پھر جائداد کا ذکر نہیں کیا۔" روی کا خیال تھا۔

وہ اماں کو لے کر خود وکیل کے پاس گیا تھا۔ ابا نے ایک جھوٹا مختار نامہ تیار کر کے اس پر اماں کے جعلی دستخط کر دیے تھے۔" ان پر فراڈ کا کیس بھی چل سکتا ہے۔"

"نہیں، نہیں وکیل صاحب بس بات ختم کر دیں۔" انہوں نے مختار نامہ پھاڑ دیا۔

"کوئی فراڈ ہوا تو نہیں نا!" روی کی اتنی زیادہ توجہ اور سہارے نے اماں کے اندر خود اعتمادی پیدا کی تھی اور اسی خود اعتمادی کے سہارے انہوں نے سب پراپرٹی اور نقد رقم روی اور گڑیا کے نام کر دی تھی۔ ابا کو پتا چلا تو وہ بہت چلائے اور بہت ہنگامہ کیا۔

"تم چالاک...... عورت جبھی...... کس کے ساتھ وکیل کے پاس گئی تھیں۔"

"میں اماں کے ساتھ گیا تھا۔" قمیص کی آستینیں فولڈ کرتا روی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔

"اس احمق عورت کو عقل نہیں کہ بچوں کے نام سب کچھ کر دیا۔ ضائع ہو جائے گا۔ کوئی بچوں کے ساتھ دھوکا بھی کر سکتا ہے۔"

"کی تو تھی ایک کوشش آپ نے فراڈ کی۔ جعلی مختار نامہ تیار کر کے اور اماں کے جعلی دستخط کر کے۔" روی نے اب ان سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کو ان کا رنگ بدلا تھا۔

"میں نے تمہارے لیے کیا تھا اپنے بچوں کے لیے ورنہ اس بے وقوف جاہل عورت سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ یہ اتنی بڑی پراپرٹی سنبھال سکتی۔" انہوں نے پینترا بدلا تھا۔

"دادا جان نے سب بندوبست کر دیا تھا۔" بڑے رسان سے جواب دیتا وہ ابا کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "زمینیں ٹھیکے پر ہیں۔ رقم اماں کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی رہے گی۔"

"وہ شخص تمہارا دادا نہیں تھا۔"

"سوری! نانا ابا نے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ وکیل نے آپ کو بتایا نہیں نانا جان نے آپ کے اکاؤنٹ میں بھی ایک کروڑ سے زیادہ کی رقم جمع کروائی ہے۔ آخر کو انہوں نے آپ کو پالا تھا۔"

"لعنت بھیجتا ہوں میں اس رقم پر...... میں مہینے میں لاکھوں کماتا ہوں۔" وہ سامنے پڑی چھوٹی ٹیبل کو ٹھوکر مارتے لاؤنج سے نکل گئے...... روی کی نظر سیڑھیوں پر پڑی تھی، ریلنگ پر ہاتھ رکھے گڑیا اوپر والی سیڑھی سے خوف زدہ سی جھانک رہی تھی۔

"گڑیا نیچے آجاؤ، واک کے لیے چلتے ہیں۔" روی بہت خوش تھا اسے لگا تھا کہ آج ابا لاجواب ہو گئے تھے۔ اس روز وہ پھر ضد کر کے اماں کو ساتھ لے گیا تھا اور اس روز پھر انہوں نے ایک بہت اچھا اور خوب صورت دن گزارا تھا۔ واپسی پر اس نے ابا کے لیے بھی آئس کریم اور بروسٹ پیک کروالیا تھا۔ اس کا خیال تھا بلکہ یقین تھا اسے کہ ابا دونوں چیزیں اٹھا کر پھینک دیں گے لیکن خلاف توقع انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا بلکہ شکریہ کہہ کر نازو کو پلیٹیں لانے کے لیے کہا تھا اور آئسکریم فریج میں رکھوا دی تھی۔

اس روز روی بڑے دنوں بعد پُرسکون نیند سویا تھا اور خواب میں اس نے مکمل گھرانا دیکھا تھا۔ ابا، اماں، وہ اور گڑیا۔ یہ خواب وہ جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھتا تھا اور اس رات اس نے سونے سے پہلے بڑے دنوں بعد ہوم سویٹ ہوم کی کہانی گڑیا کو سنائی تھی۔ نیلی چارلس کا سویٹ ہوم۔ جس میں نیلی اپنے دو جڑواں بھائیوں اور اپنے مما پاپا کے ساتھ رہتی تھی۔ نیلی کا گھر جس میں محبت کی گرمی اور حدت تھی۔ جہاں غربت تھی اور جہاں نیلی کو ہفتے میں ایک بار بھوکے پیٹ سونا پڑتا تھا پھر بھی نیلی خوش تھی کہ اس کے ماما پاپا ان تینوں سے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اور اس گھر میں سب ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کو تیار رہتے تھے حتیٰ کہ ننھے جون اور ولیم بھی... اور کوئی یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ اس نے قربانی

دی ہے۔ گڑیا نے ہمیشہ کی طرح کہانی بہت سے شوق سے سنی تھی اور سنتے سنتے سو گئی تھی۔ اماں ابا دونوں لڑائی جھگڑا نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے گڑیا سے بھی باتیں کی تھیں اور روحی سے بھی اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھا تھا حتیٰ کہ اس نے ایک روز انہیں اماں سے بھی نرمی سے بات کرتے دیکھا تھا اور ابا کے اتنے سے التفات پر جیسے اس کے اندر کے تپتے پر پانی کے چھینٹے پڑ گئے تھے اور اس کی ساری تپش ختم ہو گئی تھی۔

پھر بہت سارے دن سکون سے ہی گزر گئے تھے۔ ابا نے صرف چند بار طنز کرنے کے اماں سے کچھ نہیں کہا تھا پھر اس کا رزلٹ آ گیا۔ اس نے اے پلس گریڈ لیا تھا۔ اماں بے حد خوش تھیں۔

"شکر ہے تو اس عورت پر نہیں چلا گیا۔ میری ذہانت ملی ہے تجھے۔" اس کا دل بے حد برا ہوا تھا ابا کی بات پر لیکن اس نے اگنور کیا۔ نیچر کہاں بدلتی ہے بھلا اس نے انہیں نیچر کا مارجن دے کر اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا۔ تب ابا نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے تعلیم کی غرض سے باہر بھیجنا چاہتے ہیں۔ یو کے۔ یو ایس اے جہاں وہ چاہے تب اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"نہیں مجھے باہر نہیں جانا۔" مجھے جو کچھ کرنا ہے یہیں پاکستان میں رہ کر کروں گا۔ میں اماں اور گڑیا کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"کیوں تمہاری اماں کو چور پکڑ رہے ہیں کیا۔ وہاں جا کر کچھ تہذیب اور ادب آداب سیکھ لیتے۔"

"وہ تہذیب جو آپ سیکھ کر آئے ہیں۔" روحی کا جی چاہا وہ کہے لیکن اب مدت ہوئی اس نے ان سے بحث کرنا چھوڑ دی تھی کرتا اس نے وہی تھا جو اس نے سوچ رکھا تھا۔ اس کی پہلی ترجیح آرمی جوائن کرنا تھی۔

"اگر مجھے کمیشن نہ ملا تو میں بی ایس سی کر لوں گا اور ایک بار پھر ٹرائی کروں گا۔" اس نے اماں کو بتایا تھا روحی کو کمیشن مل گیا اور وہ پی ایم اے کے لانگ کورس کے لیے اکیڈمی چلا گیا۔ گڑیا تب نو سال کی تھی جب وہ اکیڈمی جا رہا تھا اور جب دو سال بعد وہ پاسنگ آؤٹ کے بعد واپس آیا تو گڑیا گیارہ سال کی ہو چکی تھی۔ یہ دو سال اماں نے بہت مشکل گزارے تھے لیکن جب بھی وہ چھٹی پر گھر آتا اماں نے کبھی اس پر کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔ البتہ گڑیا ہمیشہ ہی ڈری سہمی اور خوف زدہ سی ملتی تھی۔ اس کی غزالی آنکھوں میں جیسے خوف بس گیا تھا۔ اماں کی صحت پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔

"اماں....." ان کے گلے کے گرد بازو ڈالتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"آرمی میں جانا میرا شوق تھا لیکن آرمی جوائن کرنے کی ایک وجہ بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا بھی تھا۔ میں آپ کو یہاں سے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ جہاں بھی رہا گڑیا اور آپ میرے ساتھ ہی رہیں گی۔"

اس کی پاسنگ آؤٹ پر کوئی نہیں آیا تھا۔ اماں اور گڑیا تو اکیلے آ نہیں سکتی تھیں اور ابا..... اس نے انہیں فون کر کے کہا بھی تھا کہ وہ گڑیا اور اماں کو ساتھ آئیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے آنے کا۔" اس کی پوسٹنگ کھاریاں میں ہوئی تھی۔ وہ اب لیفٹیننٹ تھا اور چاہتا تھا اماں اور گڑیا اس کے ساتھ چل کر رہیں اسے آرمی کی طرف سے گھر نہیں ملا تھا لیکن اس نے سوچا تھا وہ کہیں باہر کرائے پر گھر لے لے گا لیکن اماں نے منع کر دیا۔

"تمہارے ابا ناراض ہوں گے۔" اماں کی آنکھوں کی التجا پر وہ چپ ہو گیا۔ وہ ہر ویک اینڈ پر گھر آ جاتا۔ اور یہ دن گڑیا اور اماں کے ساتھ پلک جھپکتے میں گزر جاتے۔ وہ انہیں میس میں ہونے والے لطیفے سناتا اور اپنے ساتھیوں کی اپنی باتیں بھی..... وہ بہت خوش تھا۔ بچپن میں جو اس نے سوچا تھا کہ وہ فوج میں جائے گا اس کا وہ خواب پورا ہو گیا تھا لیکن ابا کے بدل جانے کا خواب پورا نہیں ہوا تھا۔ ابا ویسے ہی تھے تنگ دل، اکھڑ اور بد مزاج۔ اب تو انہوں نے اماں کے

کمرے میں آنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا اور گیسٹ روم مستقل اپنا ٹھکانا بنالیا تھا۔ کھانے کی ٹیبل پر لاؤنج یا ڈرائنگ روم میں ان کی زبان زہر اگلتی رہتی۔

اماں کے علاوہ ان کا نشانہ دادا جان اور دادی کی ذات ہوتی۔ کبھی کبھی وہ دادا جان کو خوب گالیاں دیتے اور روی کا دل دکھتا۔ اماں چپکے چپکے روتیں اور گڑیا ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی ہولے ہولے کہتی رہتی۔

''اماں نہ روئیں، اماں چپ کریں۔'' اور کبھی ابا کی نظر اماں پر پڑ جاتی تو ان کا رونا انہیں طیش دلا دیتا۔

''کس بات کا پٹنا ہے ناشکری عورت! تجھ جیسی عورت کو میرے جیسا بندہ مل گیا۔ شکر کر۔'' اور گالیاں تھیں کے تھیٹر...... اور گڑیا اماں کو بچاتے اکثر ان کی زد میں آجاتی اور ایسا اس وقت ہوتا جب روی گھر پر نہ ہوتا، روی کی موجودگی میں وہ غصے میں آنے سے گریز ہی کرتے تھے۔ اماں ہر بات روی سے چھپانے لگی تھیں۔ انہیں جوان بیٹے کے غصے سے خوف آتا تھا اور وہ گڑیا کو بھی سختی سے منع کر دیتیں۔

''روی کو کچھ نہ بتانا...... خوا مخواہ ابا سے جھگڑا کرے گا۔'' اور گڑیا تو یوں بھی جھگڑے سے گھبراتی اور ڈرتی تھی سو وہ روی کے لاکھ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بتاتی تھی اور پھر جب گڑیا نے میٹرک کا امتحان دیا تو... روی کی پوسٹنگ لاہور ہوگئی۔ روی کی یہ تیسری پوسٹنگ تھی اور وہ لاہور آ کر بے حد خوش تھا۔ گڑیا اور اماں کے لیے یہ دن زندگی کے خوب صورت ترین دن تھے۔ ابا یو۔کے گئے ہوئے تھے اور گھر میں معمولی سی بھی ٹینشن نہ تھی، ان دنوں روی کے ساتھ وہ پورا لاہور گھومی تھی۔ وہ میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی لہٰذا اس کے پاس بہت وقت تھا۔ ان دنوں روی نے اسے ڈھیروں کتابیں خرید کر دی تھیں اور وہ بڑے بڑے ادیبوں سے روشناس ہوئی تھی۔ بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ وغیرہ ان سب کو اس نے تب ہی پڑھا تھا۔ روی بھی کتابوں کا کیڑا تھا۔

کوئی بھی نئی کتاب پڑھنے کے بعد وہ اس پر تبصرہ کرتے۔ اس نے اماں کو بھی پڑھنے کا چسکا ڈال دیا تھا۔ اب اماں بھی فارغ وقت میں کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوتیں۔ اب وہ خود پڑھ سکتی تھی لیکن اسے اب بھی روی سے کہانی سننا اچھا لگتا تھا۔ وہ فرمائش کر کے روی سے کہانی سنتی۔ روی بھی اس کی فرمائش ضرور پوری کرتا جیسے وہ ننھی بچی ہو۔ اسے آج سولہ سال کی عمر میں بھی نیلی کے سویٹ ہوم والی کہانی بہت پسند تھی اور جب نیلی کا گھر بک جاتا تھا اور انہیں ایک پہاڑی کھوہ میں رہنا پڑتا تھا تو آج بھی اسے سنتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے اور روی ہنستا۔

''نیلی...... یہ کہانی ہے۔''

''کہانیاں بھی تو زندگی کے المیوں اور واقعات سے کشید کی جاتی ہیں۔ کیا خبر کہیں حقیقت میں بھی کوئی نیلی ہو جسے کبھی کسی پہاڑی غار میں پناہ لینی پڑی ہو۔'' وہ سوچتی تھی۔

اس روز جب پہلی بار اس نے روی کے ساتھ انارکلی سے پرانی کتابیں خریدی تھیں تو روی اسے انارکلی کی بانو بازار کی چاٹ کھلانے لے گیا تھا۔ واپسی پر وہ یونہی وہاں رک کر کتابیں دیکھنے لگے تھے اور روی نے اس کے لیے وہاں سے قرۃ العین کی آگ کا دریا لی تھی۔ ان دنوں اماں کتنی خوب صورت لگنے لگی تھیں۔ اسمارٹ اور باوقار، نازک سی اماں۔ وہ اکثر سوچتی تھی آخر ابا کو اماں پسند کیوں نہیں ہیں۔ اماں تو کسی بھی شخص کا آئیڈیل ہو سکتی تھیں پھر...... ابا یو کے سے آئے تو اماں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''بڑی عیاشیاں ہو رہی ہیں میرے پیچھے۔''

ابا اچانک آئے تھے۔ وہ تینوں باہر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ دراصل روی اور گڑیا نے چپکے چپکے اماں کی سالگرہ کا پروگرام بنایا تھا۔ آج ان کا برتھ ڈے تھا۔ گڑیا اور روی نے خود اماں کے لیے کپڑے

سلیکٹ کیے تھے اور گڑیا نے ضد کر کے ان کا لائٹ سا میک اپ کیا تھا وہ ٹی پنک اور لائٹ فیروزی امتزاج کے سوٹ میں بے حد دلکش لگ رہی تھیں۔

"تم جاؤ روی، گڑیا کو لے جاؤ۔ تمہارے ابا آگئے ہیں میں نہیں جاؤں گی۔" انہوں نے آہستہ سے روی سے کہا تھا اور ابا کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"آپ فریش ہو جائیں میں چائے لگواتی ہوں۔"

"نہیں بھئی تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جاؤ سیر سپاٹے کرو۔ نازو بے دے دے گی مجھے چائے۔"

"دراصل ابا۔" روی نے بڑے تحمل سے کہا۔ "آج اماں کی سالگرہ ہے اور ہم نے اماں کو... سرپرائز دینے کا پروگرام بنایا تھا۔ تو ایسا ہے کہ آپ فریش ہو جائیں پھر آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ۔"

"نہ جی، مجھے تو بخشو تم اٹھاؤ اپنی ماں کے چوچلے۔"

"ابا جی...... یہ زندگی بہت مختصر ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہم سب مل جل کر منا لیں تو زندگی بڑی سہل ہو جاتی ہے۔"

"مجھے فلسفہ نہ پڑھا۔ تجھ سے زیادہ علم ہے میرے پاس، اس احمق عورت کے ساتھ زندگی کی خوشیاں بانٹنے سے تو بہتر ہے کہ آدمی کنویں میں چھلانگ لگا دے۔" بڑے دنوں بعد آج روی کے سامنے انہوں نے اس طرح اماں کو مخاطب کیا تھا۔ اماں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ روی نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ گڑیا، اماں کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"ٹھیک ہے ابا جی آپ آرام کریں۔ نازو ہے گھر میں، چائے کھانا جو بھی چاہیے ہوگا کہہ دیجیے گا اس سے۔" اس نے اماں کا ہاتھ پکڑا۔

"چلیں اماں۔"

اماں نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"اماں پلیز! میں نے کیک آرڈر کیا ہوا ہے اور......"

"نازو...... ابا چائے۔" "میرا بیگ میرے روم میں۔" اور خود بریف کیس اٹھا کر زور سے پاؤں زمین پر مارتے باہر چلے گئے۔ لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

"چلیں اماں۔" روی سنجیدہ تھا۔

"مجھے اس امتحان میں نہ ڈال، ضد نہ کر۔ ا[ور] اور غصہ نہ دلا۔" روی کو اماں کی بے چارگی پر دکھ ہوا۔

"ٹھیک ہے اماں جی ریلیکس ہو جائیں، کیک پیک کروا کے گھر ہی لے آتا ہوں۔" ان کو بازو سے تھام کر کے وہ انہیں صوفے کی طرف لے گیا اور صوفے پر بٹھایا۔

"گڑیا! اماں کا خیال رکھنا۔ میں ابھی آیا۔" اپنی جیب کی چابی اٹھاتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ [اس] کے جانے کے بعد اماں اٹھیں۔

"گڑیا تو بیٹھ ادھر میں تیرے ابا کے کپڑے نکال دوں۔"

"اماں۔" گڑیا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "وہ غصے میں ہیں۔"

"وہ کب غصے میں نہیں ہوتے گڑیا۔" انہوں نے آہستگی سے کہا اور گیسٹ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز تھے۔

"آپ نے جوتے بھی نہیں اتارے۔" انہوں نے کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے ان کے جوتے اتارے۔ "ایزی ہو کر لیٹ جائیں۔ میں واش روم [میں] کپڑے لٹکا دیتی ہوں۔ کچھ ریسٹ کر لیں پھر [چائے] لیجیے گا۔" نرمی سے کہتی وہ وارڈ روب کی طرف مڑیں۔ وہ زہریلی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اماں [کو] ان کی نظریں اپنی پیٹھ میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ شلوار قمیص کا سوٹ نکال کر مڑیں تو وہ جیسے پھنکار[ے] تھے۔

"وہ تین ماہ کے لیے گھر سے گیا تھا۔ میا[ں]... ہونے لگیں۔ ہوٹنگ ہوتی تھی روز —— میرے...

رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں میرا... میرا پیسہ تھا امینہ بیگم —— میرا حق تھا۔ بیٹا تھا میں ان کا لیکن تو نے اپنی چالاکی اور میسنے پن سے اپنے نام کروا لیا سب کچھ میرا حق تھا میرا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

"آپ بیٹے ہی تو نہیں بنے ان کے حبیب...... بیٹا بن کر دکھاتے تو ماموں مامی یوں زخمی دل لیے اس دنیا سے نہ جاتے۔" سگے ماموں کا دکھ امینہ کو بھی رُلا دیتا تھا اور اسی دکھ کے زیر اثر آج پہلی بار انہوں نے حبیب خان کی بات کے جواب میں پلٹ کر کچھ کہا تھا۔

"تو...... تو وہ ٹکے کی عورت مجھے بتا رہی ہے کہ مجھے کیا کرنا تھا...... تو......" انہوں نے ایش ٹرے اٹھا کر ان کی طرف پھینکا تھا اور پھر امینہ بیگم تھیں اور حبیب خان کے جوتے، مکے لاتیں اور زبان سے نکلنے والی گالیاں۔

روی جب کیک لیے گھر آیا تو گڑیا جو دروازے کے ساتھ سہمی کھڑی تھی روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اسے پچکارتے ہوئے اس نے نازو کی طرف دیکھا جو گیسٹ روم کے بند دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے گڑیا کو صوفے پر بٹھایا اور نازو کو پانی لانے کے لیے کہا اور خود بے حد ضبط کیے گیسٹ روم کی طرف بڑھا۔ تب ہی گیسٹ روم کا دروازہ کھلا اور ابا نے اماں کو باہر دھکا دے کر دروازہ بند کر لیا۔

وہ تیر کی طرح اماں کی طرف لپکا تھا پھر اس نے انہیں اپنے توانا بازوؤں میں اٹھا لیا اور سیدھا سیڑھیاں چڑھتا ہوا ان کے کمرے میں آیا تھا۔ اماں ہولے ہولے سسک رہی تھیں۔ ان کا چہرہ نیل سے بھرا تھا۔ اس نے ان سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ گڑیا کو آئیوڈیکس لانے کا کہہ کر وہ ان کے بیڈ کے پاس ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ گڑیا نے انہیں آئیوڈیکس لگائی تھی اور گرم گرم دودھ کے ساتھ پین کلر کھانے کو دی تھی۔

"اماں پلیز میری بات مان لیں۔" بڑی دیر بعد اس نے کہا تھا۔ انہوں نے اپنے جوان مضبوط بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور تڑپ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے روی جیسے تیری مرضی۔" اور انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس رات گڑیا نے اور اس نے پوری رات اماں کے سرہانے جاگ کر گزاری تھی اور اگلے روز سے ہی وہ ایک چھوٹے لیکن اچھے سے گھر کی تلاش کرنے لگا تھا۔ وہ یہ گھر خریدنا چاہتا تھا مستقل ٹھکانے کے طور پر ورنہ اس کی جہاں بھی پوسٹنگ ہوتی اماں اور گڑیا نے اس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ بالآخر اسے ایک اچھی سوسائٹی میں دس مرلے کا گھر پسند آ گیا تھا۔ اردگرد کے لوگ بھی اچھے تھے لیکن جب وہ اماں سے چیک لے کر گیا تو پتا چلا کہ ان کے اکاؤنٹ میں تو صرف دس ہزار ہیں وہ بنا کچھ کہے بینک سے گھر آ گیا تھا۔

"اماں آپ نے کبھی ابا کو چیک دیا، کوئی رقم......"

"ہاں دو دفعہ، انہیں رقم کی ضرورت تھی تو انہوں نے مانگے تھے مجھ سے۔"

"کتنے؟"

"ایک دفعہ پچاس ہزار اور ایک دفعہ دو لاکھ۔"

روی خاموش تھا۔

"بیٹا وہ تمہارے باپ ہیں اور ماموں جان نے انہیں بیٹا بنایا تھا۔"

"اماں انہوں نے آپ کے اکاؤنٹ سے سب پیسہ نکلوا لیا ہے، آپ کے جعلی دستخط کر کے۔" یہ بھی غنیمت تھا کہ اماں نے روی اور گڑیا کے اکاؤنٹ میں بھی رقم جمع کروائی تھی۔

"بیٹا اپنے باپ کے خلاف کوئی کیس مت کرنا۔ کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ اتنی پراپرٹی ہے کچھ فروخت کر دو اور گھر لے لو۔ اچھا سا ہی ایک بار......" اور روی اماں کی بات کہیں ٹال سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے اماں ابھی ہم کوئی گھر کرائے

پر لے لیتے ہیں۔" اور ابھی اسے کوئی گھر پسند ہی نہیں آیا تھا کہ وہ واقعہ ہوگیا۔ اماں لاؤنج میں بیٹھی تھیں اور ان کے چہرے پر ابھی بھی نیل پڑے ہوئے تھے۔ ماتھے پر گومڑ تھا۔

"اماں جی۔" وہ ان کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں نے آج ایک گھر لے لیا ہے کرائے پر بعد میں پھر اپنا لے لیں گے، آپ اپنی ضروری چیزیں پیک کر لیجیے گا۔"

"روی کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے بیٹا، کیا ہم یہاں رہ کر سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکتے۔"

"اماں جی ہم نے اب تک اتنے سالوں میں کیا ٹھیک کر لیا ہے۔ ابا جی نہیں بدلیں گے اور مجھ سے آپ کی عزت نفس بار بار مجروح ہوتی نہیں دیکھی جاتی۔ میرے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے شاید ہمارے چلے جانے سے انہیں اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو جائے۔"

تب ہی ابا نے لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہمیشہ کی طرح وہ بہت شاندار لگ رہے تھے۔ ٹائی سے لے کر جوتے تک ہر چیز برانڈڈ تھی۔ ان کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے لاؤنج کے داخلی دروازے پر رک کر روی اور اماں کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اماں کا ہاتھ روی کے ہاتھ میں تھا۔

"تو دلجوئیاں ہو رہی ہیں ماں کی۔" لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ اور لہجے میں تلخی...... روی نے کچھ نہیں کہا تھا بس ایک شاکی نظر ان پر ڈالی تھی اور پھر نظریں جھکا لی تھیں۔

"یہ میرے پیچھے ماں کو کس راستے پر لگا دیا تھا تو نے۔" روی نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں ابا؟"

"سنا ہے بڑی پارٹیوں شارٹیوں میں لے جاتا تھا اپنے افسروں کو پیش کرتا......"

"ابا جی......" روی زور سے دہاڑا تھا۔" سے آگے ایک لفظ مت کہیے گا ورنہ تو......"

"نہیں تو کیا کرے گا تو۔" انہوں نے ہاتھ دیوار پر رکھا۔ روی نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ اماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ روی نے مڑ کر دیکھا۔ اماں کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"یہ آپ کے گندے خون کا اثر ہے کہ آپ کی سوچ اتنی گھٹیا ہے۔"

"اچھا میرا خون گندہ ہے...... تو کس کا خون ہے کیا کسی اور کا۔"

"میرے وجود میں میری ماں کا خون بھی ہے جو آپ کے خون پر غالب آ گیا ہے۔"

"اچھا میں سمجھا کسی اور کا خون ہے۔" طنزیہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"ابا......" اب کے اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔" آپ کو میری ماں کی پاکیزگی پر الزام لگاتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

"اچھا۔" وہ تیر چلا کر واپس مڑے اور انہوں نے دروازہ کھول کر نازو کو آواز دی تھی۔" اندر آ جاؤ باہر ہی کھڑی ہوئی ہو۔" نازو اندر آ گئی تھی۔ شرمائی، لجائی، دوپٹے کے کونے کو انگلی پر لپیٹتی۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس، کسی مہنگے بوتیک سے خریدا گیا وہ سوٹ اس کے جسم پر اجنبی سا لگ رہا تھا۔

"میں نے نازو سے شادی کر لی ہے۔" انہوں نے ایک اور تیر چلایا تھا......" اور اب تم اپنی ماں کو یہاں سے لے کر دفع ہو جاؤ۔" حیرت کا جھٹکا کھا کر روی نے نازو کو دیکھا۔ سولہ سترہ سال کی نازو...... ان پڑھ جاہل...... اس کی اتنی شاندار، باوقار اور میٹرک پاس ماں انہیں ساری زندگی احمق اور جاہل دکھتی رہی تھی اور اب یہ نازو...... کیا یہ کیمبرج یا آکسفورڈ سے پڑھ کر آئی تھی۔ اماں کا ہاتھ اس کے بازو سے ہٹ گیا تھا۔ ابا نازو کا ہاتھ پکڑے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ ساکت

بیٹھی تھیں اور سامنے دیوار کو سپاٹ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اماں جی۔" اس نے ان کا بازو ہلایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظروں کے خالی پن سے گھبرا کر اس نے انہیں جھنجوڑ ڈالا۔

"اماں...... اماں جی۔" وہ لہرا کر اس کی گود میں آ گری تھیں اور وہ ان کے رخسار تھپتھپا رہا تھا۔ انہیں آوازیں دے رہا تھا لیکن وہ پتھر کی طرح ساکت پڑی تھیں۔

☆☆☆

بھاگتے ہوئے وہ پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ یکدم بھاگتے بھاگتے اس کا پاؤں مڑ گیا۔ وہ یک دم پاؤں پکڑ کر بیٹھی تھی اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ تو ڈاکٹر کے کلینک کی طرف بھاگی تھی لیکن یہ گلی تو کوئی اور تھی۔ پاؤں کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی تب اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو بے اختیار اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ نوشیرواں تھا۔

"سنبھل...... سنبھل کیا ہوا۔ آپ کس سے خوف زدہ ہو کر بھاگی تھیں۔ میں تھا نا آپ کے ساتھ آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے غیر ارادی طور پر قریب آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

"کوئی میری لاش سے گزر کر ہی آپ کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہم قبائلی لوگ اپنی عزت کے لیے جان سے گزر جاتے ہیں۔"

"وہ بس ایسے ہی میں ڈر گئی۔" وہ ہکلائی تھی۔

"او کے چلیں ابھی گھر چل کر تفصیل سے بات ہوتی ہے۔"

"مگر وہ...... وہاں...... روڈ پر تو میں نے خود انہیں یوٹرن سے گاڑی موڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا مجھے آپ کے ساتھ کھڑے۔" وہ زرد ہو رہی تھی۔ نوشیرواں نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور تسلی کے سے انداز میں مسکرایا۔

"میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔" لیکن وہ یوں ہی گھبرائی سی ادھر ادھر دیکھتی رہی جیسے ابھی کسی گلی سے وہ نکل آئیں گے۔

"او کے ہم یہاں پچھلی گلی سے نکل کر چوک پر پہنچ جائیں گے اور وہاں سے پھر رکشا کر لیں گے۔"

"آپ کو پتا ہے ان رستوں کا۔"

"ہاں......" وہ مسکرایا۔

"رستے نہ بھی پتا ہوں تو تلاش کرنے کا ہنر آتا ہے مجھے۔" وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ سہمی سہمی خوف زدہ سی۔

پھر نوشیرواں نے ایسا ہی کیا تھا جانے کن کن گلیوں سے نکل کر وہ چوک پر آ گئے تھے۔ وہاں سے رکشا کر کے جب وہ اپنی گلی میں گھر کے سامنے پہنچی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

"تھینک یو۔" اس نے تشکر نظروں سے اسے دیکھا۔" یہ دوسری بار ہے جب آپ نے میری مدد کی۔"

"تو کبھی آپ بھی ہماری مدد کر دیجیے گا۔"

"میں بھلا کیا مدد کر سکتی ہوں آپ کی۔" اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"وقت آنے پر بتا دیں گے۔" اس نے دروازے پر دستک دی تو نوشیرواں نے پوچھا۔

"کیا وہ یہاں بھی آ سکتا ہے۔"

"نہیں...... انہیں اس گھر کا پتا نہیں ہے......" جواب دے کر وہ پھر دستک دینے لگی۔ دیر ہو گئی تھی اماں شاید جاگ گئیں ہوں گی اس نے سوچا تب ہی فضیلت نے دروازہ کھول دیا۔

"اماں جاگ گئیں کیا؟"

"نہیں۔" فضیلت جواب دے کر پلٹ گئی۔ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے دیکھا وہ بھی اپنے گھر جا رہا تھا۔

اماں کے کمرے میں آ کر اس نے چادر اتارنے سے پہلے اے سی آن کیا۔ اماں کروٹ کے

مل سوری تھیں۔ چادر کے پلو سے چہرہ پونچھتے ہوئے وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اطمینان کی سانس لی۔ جیسے وہ کسی محفوظ پناہ گاہ میں آ گئی ہو۔ پھر اس کی نظر اپنے دائیں ہاتھ پر پڑی اور اسے لگا جیسے نوشیرواں کا لمس زندہ ہو گیا ہو۔ کلائی پر جہاں سے نوشیرواں نے اسے پکڑ کر اٹھایا تھا جیسے اب بھی وہ اس کے ہاتھ کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "یہ نوشیرواں......"

"نہیں بھلا میں کیوں اس کے متعلق سوچ رہی ہوں۔" اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور فضیلت کو آواز دی۔

"ایک گلاس پانی پلا دو۔"

"میں چلی جاؤں جی۔" پانی کے گلاس کے ساتھ ہی فضیلت فرمائش لیے کھڑی تھی۔

"کیوں؟"

"آپ تو گھر میں ہو نا جی اماں جی کے پاس۔"

"ہاں...... لیکن۔"

"وہ جی کام تو میں نے سارا کر دیا ہے۔ صفائی، برتن، آٹا بھی گوندھ دیا ہے۔ بس جی ہانڈی آپ خود بنا لینا۔ کپڑے میں کل دھولوں گی آ کر۔"

"تمہیں پتا ہے فضیلت میں کام کی وجہ سے نہیں اپنی تنہائی کی وجہ سے شام تک تمہیں روکتی ہوں۔ میرا دل گھبراتا ہے اکیلے ورنہ اتوار والے دن تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

"وہ تو جی ٹھیک ہے پر مجھے آج کام سے جانا تھا۔ آپ کا دل بہت گھبرائے تو آپ اُدھر میراں اماں کی طرف چلے جانا۔ اماں جی کو بھی لے جانا۔ اچھا ہے ہر وقت گھر میں رہتی ہیں کہیں آتی جاتی بھی نہیں۔ خوش ہوں گی دیکھ لینا۔" وہ تو مشورے دے کر چلی گئی تھی لیکن بیسل کو اس کا مشورہ پسند آیا تھا۔

"ہاں اماں تو ہمیشہ گھر میں رہتی ہیں۔ اگر میں انہیں کہیں لے جایا کروں تو شاید ان پر اچھا اثر پڑے۔ شام کو اور بھی رات کو۔ سب بلاک کی اکثر عورتیں پارک میں واک کے لیے جاتی تھیں۔ میں بھی اماں کو لے جاؤں گی۔" اس نے فیصلہ کیا۔

کھانا تیار کر کے اس نے اماں کو اٹھایا پھر اماں کو نہلا کر کپڑے بدلوا کے ان کے بال بنائے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ اماں کو نہانے کے لیے واش روم میں چھوڑ آتی تو وہ گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی تھیں۔ تب سے نہانے میں ان کی مدد کرنے لگی تھی۔ ان کے بال سلجھاتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح باتیں کرتی رہی۔ اس نے انہیں آج کے واقعے کے متعلق بھی بتایا تھا۔

"اماں ہم مروان کے بغیر کتنے تنہا ہیں۔ کتنی ضرورت تھی نا اس کی...... ہر قدم پر، ہر [illegible]" اس نے دیکھا مروان کے نام پر اماں نے وا[illegible] بائیں دیکھا تھا۔ پھر سر جھکا لیا تھا۔

"اماں جی میں بہت تھکنے لگی ہوں۔ جی چاہتا ہے میں اور آپ کچھ کھا کر سو جائیں۔ ہمیشہ کی گہری نیند۔" اماں نے جھرجھری لی تھی۔ ان کی چھتیا بنا [illegible] ان کے سامنے آ بیٹھی، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"اماں جی۔" اس نے ان کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"یوں لگتا ہے اماں جیسے اس بھری دنیا میں صرف ہم دونوں ہی ہیں جو بالکل تنہا ہیں اکیلے...... کوئی نہیں...... کیوں نہ اماں ایسا کریں کسی دن دونوں گھر سے نکل چلیں اور ریل کی پٹری پر جا کر لیٹ جائیں اور پھر کوئی ریل ہمیں کچلتی ہوئی چلی جائے اور سب دکھوں کا خاتمہ ہو جائے۔" پتا نہیں کیوں آج اتنی قنوطی ہو رہی تھی اور اتنی مایوس حالانکہ مروان اسے کتنا سمجھاتا تھا۔

"بیسل یہ زندگی بہت مشکل ہے۔ میں تمہارے ساتھ تمہارا ہاتھ پکڑ کر نہیں چلوں گا۔ کچھ ایسے بھی آئیں گے جب تمہیں اکیلے چلنا پڑے گا۔ کیا کرو گی بیٹا ان لمحوں کے لیے خود کو بہادر بناؤ۔ یہ جو تمہارے اندر بیٹھ گیا ہے اسے دل سے [illegible] دو۔" وہ مروان کے متعلق سوچنے لگی تھی اور اسے محسوس بھی نہیں ہوا تھا کہ اماں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں اور اس کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھ رہی تھیں۔ اس کا دھیان نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے سکون مل رہا تھا اور پھر وہ یونہی سوچتے سوچتے اماں کی گود میں سر رکھے سو گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی وہ یونہی سوئی رہی۔ پھر شاید کوئی آہٹ ہوئی تھی یا یونہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی وہ ابھی تک اماں کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اور اماں اسی طرح بیٹھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سپاٹ، خالی آنکھوں میں محبتوں کے رنگ جھلملاتے صاف نظر آ رہے تھے۔

"اماں جی۔" وہ یک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ اماں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اور ہولے ہولے اسے تھپک رہی تھیں۔

"اماں جی۔" اس نے ان سے الگ ہو کر ان کے ہاتھ چومے اور پھر ان کے گھٹنے دبانے لگی۔

"اماں جی۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔" اماں اسی محبت سے اسے دیکھتی رہیں۔ اس کا جی چاہا وہ گول گول چک پھیریاں کھائے خوش ہو، اماں نے کتنے سالوں بعد اسے یوں محبت سے دیکھا تھا۔

"مروان...... مروان......" وہ اسے بتانے کے لیے باہر بھاگی پھر پلٹ آئی۔

"اماں جی آج آپ نے دوائی بھی نہیں کھائی۔" پھر اس نے انہیں ان کی میڈیسن دیں اور چائے کا پوچھا۔

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا پھر لیٹ جائیں تھک گئی ہوں گی۔" انہیں لٹا کر وہ اپنی کتابیں لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اسے نوٹس تیار کرنا تھے لیکن پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ابھی صرف پانچ بجے تھے اور باہر پورے صحن میں دھوپ پھیلی تھی...... اسے پھر نوشیرواں کا خیال آ گیا۔ اس کی نظر اپنی کلائی پر پڑی۔ وہ کتنی ہی دیر کلائی کو دیکھتی رہی اور پھر کتاب پر نظریں جما لیں لیکن لفظ آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ کتابوں کے صفحوں میں سے جیسے نوشیرواں جھانکنے لگا تھا۔

اس نے جھنجلا کر کتاب بند کر دی۔ اماں بیڈ پر لیٹی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ آج ڈاکٹر نے دوائیں بدل دی تھیں ورنہ اماں دوا کھاتے ہی سو جاتی تھیں۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس آئی۔

"اماں جی سکنجبین بنا کر لے آؤں؟" انہوں نے سر ہلایا تھا۔ وہ ایک بار پھر حیران ہوئی تھی۔ وہ تو ہمیشہ ہی اماں سے ہر بات پوچھتی تھی کی عادتاً۔ اماں نے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جلدی جلدی کچن میں گئی اور سکنجبین بنا کر لے آئی۔

"بہت گرمی ہے آج...... ہیں نا۔" اس نے گلاس انہیں پکڑاتے ہوئے کہا۔ آپ کو یاد ہے نا جب مروان ایسے موسم میں یہاں ہوتا تو روز ہی سکنجبین بنوا کر پیتا تھا۔" اماں بس غور سے اسے دیکھ رہی تھیں، پتا نہیں اس کے چہرے میں کیا کھوج رہی تھیں۔

مغرب کے بعد وہ اماں کو ساتھ لے کر میراں اماں کے گھر آئی۔ یہ پہلی بار تھا جب وہ ڈاکٹر کے علاوہ اماں کو کہیں لے کر آئی تھی۔ دروازہ میراں اماں نے ہی کھولا تھا اور انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں۔

"یہ تم نے اچھا کیا بیسل...... اپنے بہن کو لے آئیں، میں صبح بھی شیری سے کہہ رہی تھی۔ اکیلی بچی ہے ماں کو کہیں لے جا بھی نہیں سکتی کہ ان کا دل بہلے۔" وہ ان کے ساتھ برآمدے تک آئی۔ یہاں بھی برآمدے میں بالکل ویسا ہی تخت بچھا تھا جیسا ان کے ہاں تھا۔ اور غالباً یہاں بھی پہلے سے موجود تھا اور ان کے آنے سے پہلے میراں اماں شاید یہیں بیٹھی تھیں کیونکہ

تخت پر ان کی جانماز تہ کی ہوئی پڑی تھی اور پاس ہی تسبیح پڑی تھی۔

"یہاں ہی بیٹھ جاتے ہیں اماں جان۔" انہیں اندر کی طرف جاتے دیکھ کر اس نے کہا اور برآمدے کے دائیں طرف پڑی کرسی اٹھا لائی اور تخت کے قریب رکھ کر اماں کو اس پر بٹھایا اور خود تخت پوش پر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"بچہ یہ ادھر اس کمرے میں شیری ہوگا ذرا اسے تو بلا لا دوڑ کر بازار سے کچھ لے آئے اور چائے کا پانی رکھ دے۔"

"نہیں، اماں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تکلف نہیں بچہ ہماری خوشی ہے، امینہ بہن پہلی دفعہ ہمارے گھر آئی ہیں۔ جا شاباش بچہ......" وہ جھجکتے ہوئے اٹھی، اماں کی طرف دیکھا۔ اماں بے نیازی بیٹھی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور نوشیرواں ایک میز کے پاس کھڑا تھا۔ دروازے کے پاس جا کر وہ رک گئی۔ نوشیرواں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اسکیل تھا۔

"آجائیں...... میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"جی...... میرا...... لیکن آپ کو کیسے پتا چلا میں آج ادھر آؤں گی۔" اسے حیرت ہوئی۔

"میرے وجدان نے مجھے بتایا تھا۔" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری اور آنکھوں میں کوندا سا لپکا تھا۔ وہ حیران سی دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

"آجائیں نا رک کیوں گئی ہیں۔"

"کیا آپ سچ مچ میں کوئی نجومی ہیں؟" اسے اپنی صبح والی بات یاد آئی تو بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ نوشیرواں ہنسا اور ہنسی نے اس کا پورا چہرہ روشن کر دیا تھا۔

"دراصل یہ میرے دل کی خواہش تھی بسمل بی بی جسے میں نے انتظار کا نام دیا۔ ورنہ میں ان معنو میں ہرگز نجومی نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" اس کے لفظوں پر غور کرتے ہوئے اندر کمرے میں آ تو اس کی نظر میز پر پڑی۔ میز پر ایک بڑا نقشہ پھیلا تھا۔ کئی جگہوں پر سرخ نشان لگے تھے۔

"یہ آپ کیا کر رہے تھے۔"

"میں یہ نقشہ دیکھ رہا تھا۔ یہ کارگل ہے۔ یہ چھو سا قصبہ ہے اور یہ کارگل کا پہاڑی سلسلہ ہے جو تقر 44 میل لمبا اور 7 میل چوڑا ہے۔" وہ ذرا سا کھوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے نقشے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"سوری۔" وہ چونکا۔ "میں خوا مخواہ آپ کو کرنے لگا۔ دراصل یہ میرا ایک ویک پوائنٹ کارگل۔ ابھی جب آپ آئیں تو میں تصوری تصو میں خود کو کارگل سیکٹر میں دیکھ رہا تھا۔ یہی جون کا تھا جب میں......" وہ نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی شاید اس نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی تب ہی با ادھوری چھوڑ کر وہ اسے دیکھنے لگا۔

"بیٹھیں نا پلیز، مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا تھیں۔"

"وہ میں......" وہ چونکی۔ "اماں جان آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے مجھے۔" وہ ا گہری نظر اس پر ڈال کر نقشہ رول کرنے لگا۔ وہ بہت خاموش اور سنجیدہ لگنے لگی تھی۔ میراں اماں اس کے منع کرنے کے باوجود نوشیرواں کو بازار بھیج تھا۔

"نہ بچہ...... امینہ بہن پہلی دفعہ میرے گھر ہیں۔ کبھی کبھار انہیں گھر سے باہر کہیں لے جایا کبھی ہمارے ہاں، کبھی بازار......" میراں اماں رہی تھیں لیکن اس کا ذہن اندر ٹیبل پر موجود نقشے طرف تھا۔ وہاں نقشے پر کارگل کے گرد سرخ دائرہ ہوا تھا۔ کارگل جس کے متعلق مروان نے اسے بتایا سائبیریا کے بعد دوسرا سرد ترین علاقہ ہے۔

کا درجہ حرارت منفی 60 ہے۔ یہاں برف ہی برف ہے۔ ٹھنڈ ہڈیوں میں اتری جاتی ہے پھر بھی ہم اپنے مشن کی کامیابی تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہاں مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر حسام کھڑا ہوا ہے۔ کیسا بانکا جوان ہے کبھی کبھی مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ اس کے پاؤں frostbite کے باعث گل چکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے لیکن یہ یہاں سے جانے کو تیار ہی نہیں۔ اس کا جذبہ شہادت دیکھنے کے لائق ہے۔ بسمل جب بھی اسے آرام کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو مسکراتا ہے اور کہتا ہے کہ میں شہادت کے لیے چن لیا گیا ہوں۔ جب بھی تمہارا اور اماں کا خیال مجھے کمزور کرنے لگتا ہے تو کیپٹن حسام کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔" وہ ہاتھ گود میں دھرے سامنے کچن کی دیوار کو دیکھ رہی تھی اور اس کے سامنے کارگل کے برف زار تھے پھر برف زاروں پر خون پھیل گیا۔ سفیدی سرخی میں بدل گئی۔

"بسمل بچہ......" میراں اماں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"بچہ اندر کچن میں جا کر چائے کا پانی رکھ دے۔ شیری آتا ہوگا۔ چائے وہ آ کر بنا دے گا۔"

"میں چائے بنا لوں گی اماں جان۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن سامنے ہی تھا صحن میں دائیں طرف، کچن کے آگے شیڈ سا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے اس کے گھر میں تھا۔ جاتے جاتے اس نے دیکھا۔ اماں کا ہاتھ میراں اماں کے ہاتھ میں تھا۔ اماں کی آنکھوں میں چمک سی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ۔ اماں کو میراں اماں کی باتیں پسند آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اس کا ریسپونس دے رہی تھیں اور یہ بڑی کامیابی تھی۔ ڈاکٹر عرفان بہت پرجوش تھے۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ وہ اگلے ہفتے اماں کو ضرور لے کر آئے۔ وہ خود ان کے ساتھ ایک میٹنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ابھی تک مروان کو اماں کی اس امپروومنٹ کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ یہاں سے جا کر پہلے وہ مروان کو بتائے گی اماں کے متعلق۔

کچن میں جا کر اس نے چائے کا پانی رکھا۔ پھر اس کی نظر ٹرالی پر پڑی تو اس نے ٹرالی میں پلیٹیں، چمچ، شوگر پاٹ وغیرہ رکھے۔ اب پتا نہیں نوشیرواں کیا کیا لے کر آتا ہے۔ اس نے صافی اٹھا کر کاؤنٹر پر گرا پانی پونچھا تب ہی نوشیرواں شاپر اٹھائے کچن میں آیا۔

"ارے آپ نے کیوں تکلیف کی میں کر لیتا خود آ کر۔"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" اس نے نوشیرواں کے ہاتھ سے شاپر لے لیے۔

"ارے یہ اتنا کچھ کیوں اٹھا لائے ہیں آپ۔ اماں کی خوراک تو بالکل کم ہے۔"

"دل کی خوشی کے لیے۔" اس نے زیر لب کہا تھا۔ وہ آہستگی سے کہہ کر کیبنٹ سے ڈشز اور پلیٹیں نکالنے لگا۔ دہی بھلے، میڈیم سائز پزا، کیک، پیٹیز، چکن رول، نمکو اور جانے کیا کیا۔

"لگتا ہے آپ نے ہمیں بہت پیٹو سمجھ لیا یا آپ کا خیال ہے کہ ہم کسی قحط زدہ علاقے سے آئے ہیں۔" مدھم مسکراہٹ کے ساتھ وہ کیبنٹ سے نکالی جانے والی پلیٹوں کو صافی سے پونچھنے لگا۔ بسمل ان میں سامان رکھنے لگی۔

کاش کوئی یہ منظر ہمیشہ کے لیے یہاں ہی ساکت کر دیتا...... ایک مکمل مطمئن سی فیملی کا یہ منظر...... اس کے اندر حسرت نے چٹکی بھری۔ وہ ایک مکمل، خوش اور مطمئن گھر کو ترسا ہوا تھا۔ وہ ٹرالی لے کر باہر جانے لگا۔

"آپ بھی آجائیں چائے میں آ کر بنا لیتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے میں بھی چائے اچھی ہی بنا لیتی ہوں۔"

"آپ......" وہ رکا۔ "آپ تو سب ہی کچھ اچھا کرتی ہوں گی یہ مجھے یقین ہے۔" اس کی آواز بسمل کو بوجھل سی لگی لیکن وہ سر جھٹک کر ٹی پاٹ میں

پتی ڈالنے لگی۔

چائے دم کر کے وہ واپس آئی تو وہ اماں کو اپنے ہاتھ سے پراٹھا توڑ توڑ کر کھلاتے ہوئے نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہا تھا۔ اماں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی بالکل ایسا ہی ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا تھا۔ نوشیرواں کی جگہ مروان تھا اور اماں کے منہ میں یونہی پراٹھے کے نوالے بنا بنا کر ڈال رہا تھا۔ اماں ہنس رہی تھیں اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر منع کر رہی تھیں۔

"میں خود کھا لوں گی بیٹا...... بس مجھے پراٹھا کچھ خاص پسند نہیں ہے۔ اچھا دو میں خود کھا لیتی ہوں۔" اس کے کانوں میں اماں کی آواز آ رہی تھی اور پھر مروان کی آواز......

"نہیں آج تو میں اپنی اماں کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا۔" یکدم اماں نے نوشیرواں کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"میں خود کھا لوں گی۔" اور پھر چونک کر انہوں نے نوشیرواں کے بازو سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ اب وہ اجنبی نظروں سے نوشیرواں کو دیکھ رہی تھیں۔

سیمل اماں کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ بھی اسی منظر میں چلی گئی تھیں۔ پیچھے کئی سال پہلے...... سیمل کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میزبان اماں اور نوشیرواں کے خیال سے اس نے دل پر جبر کر کے ساری چیزیں ہی چکھی تھیں۔ نوشیرواں نے کئی بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر جب اس نے چائے بنا کر سب کو دی تو نوشیرواں نے ایک گھونٹ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ واقعی بہت اچھی چائے بناتی ہیں۔ مجھ سے کبھی ایسی چائے نہیں بنی۔ کبھی کڑوی ہو جاتی ہے، کبھی بالکل ہی پتی کم......"

"مجھے مروان نے چائے بنانا سکھائی تھی۔" سیمل مسکرائی۔

"اچھا تو آپ مجھے سکھا دیجیے گا۔" اس نے سر

ہلایا۔ عشا کی اذان کے بعد وہ گھر جانے کے لیے اٹھی تھی۔ اماں ساتھ نہ ہوتیں تو وہ سیڑھی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر جاتی لیکن اب اماں ساتھ تھیں اور اسے گلی سے جانا تھا۔ وہ اٹھی تو نوشیرواں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"آیئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں یہ ساتھ تو گھر ہے۔" اس نے منع کیا تھا لیکن نوشیرواں بنا کچھ کہے ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔ اس کا یہ کیئرنگ انداز سیمل کو اچھا لگا تھا۔ دروازے کا لاک کھول کر اس نے اندر قدم رکھا اور اماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اللہ حافظ......" نوشیرواں کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

"اللہ حافظ..." اماں اس سے ہاتھ چھڑا کر برآمدے کی طرف جا رہی تھیں۔

"دوسروں کی دل آزاری نہ کرنا اور ان کا خیال رکھنا اچھی بات ہے لیکن اتنا جبر بھی اچھا نہیں ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا۔

"آپ کا جی نہیں چاہ رہا تھا کچھ کھانے کو لیکن آپ ہمارے خیال سے... بہت شکریہ لیکن مجھے آپ کا خود پر جبر کرنا......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ وہ تو اماں کی طرف متوجہ تھا پھر اس نے کب اسے مانیٹر کیا تھا...... وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گلی میں جلتے بلب کی روشنی نوشیرواں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ براؤن آنکھیں، خمدار پلکیں، دراز قد، سیمل نے نظریں جھکا لیں۔

"کیا مروان کا خیال آ گیا تھا آپ کو؟" اس نے اچانک کہا تھا۔

"ہاں۔" وہ جھجکے بغیر بولی۔

"مروان بالکل آپ کی طرح کبھی کبھی اماں کو نوالے بنا کر کھلاتا تھا۔"

"آپ مروان کو اتنا مس کرتی ہیں تو اسے بلا کیوں نہیں لیتیں۔ کیا اس کا آنا بہت مشکل ہے۔"

وہ دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھے ساکت

کھڑی تھی۔

"آپ مروان کو کہیں...... اماں کی خاطر وہ ایک چکر لگا جائے۔ اماں کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ اسے ہر صورت آنا ہو گا سیمل، اماں کی صحت کے لیے یہ سب ضروری ہے۔" پتا نہیں کب اس نے اماں کو اماں کہنا شروع کیا تھا۔ سیمل نے اب کے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر جانے کے بجائے سامنے والی گلی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے اسے گلی کا موڑ مڑتے دیکھا اور پھر دروازہ بند کر کے اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ چکی تھیں۔ دروازے سے ٹیک لگائے ہوئے اس کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ "اسے ہر صورت آنا ہو گا......

...... مگر کیسے ... کیسے آئے گا وہ اتنی دور سے۔ مروان آ جاؤ، پلیز......" روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اماں پتا نہیں کب اٹھ کر اس کے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی اور ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

"اماں مروان...... وہ کیوں نہیں آتا ہمارے پاس... ہمیں اس کی بہت ضرورت ہے، بہت زیادہ......" اماں اسے تھپک رہی تھیں اس کے ہاتھوں اور رخساروں کو چوم رہی تھیں اور وہ مروان کو پکار پکار کر رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اماں کی نگران اور محافظ بنی ہوئی تھی اور آج اماں اس کی نگران بن گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ پھر اس کے ہاتھ پکڑے پکڑے اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ اماں نے اسے بیڈ پر لیٹنے کے لیے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گئی تو وہ واش روم سے تولیا گیلا کر کے لے آئیں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ پھر اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگیں۔ اماں کے ہاتھوں کے لمس میں کتنا سکون تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے پھر آنسو مچل اٹھے تھے

احمق

دنیا میں لڑکیوں سے زیادہ احمق کوئی اور نہیں ہوتا۔ خوش فہمی کا آغاز اور اختتام ہم پر ہی ہوتا ہے۔ ساری عمر ہم محبت کی بیساکھیوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں تاکہ زندگی کی ریس شروع کر سکیں۔ ہمیں ہر مرد کے بارے میں خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ آئے گا ہمیں دیکھے گا اور ہمارا ہو جائے گا کوئی ہم سے ہمدردی کرنے لگے تو ہمیں خوش فہمی ہونے لگتی ہے۔ کوئی ہمیں سراہے تو ہمیں اپنی مٹھی میں قید نظر آنے لگتا ہے۔ کوئی ہمارے ساتھ وقت گزارے تو ہمارے ہوش و حواس اپنے ٹھکانے پر نہیں رہتے۔ عمر کا خیال ہے مجھ میں میچورٹی نہیں، یہ تو کسی لڑکی میں نہیں ہوتی۔ کبھی لڑکیاں بھی میچور ہوتی ہیں، ہم میں میچورٹی صرف تب آتی ہے جب ہمیں ریجیکٹ کیا جاتا ہے۔

عمیرہ احمد کے ناول امربیل سے
انعم وقار حیدر کا انتخاب

لیکن اس نے ان آنسوؤں کو بہنے نہ دیا۔ اماں ہولے ہولے اس کا سر دبا رہی تھیں۔ بند آنکھوں کے سامنے نوشیرواں کا سراپا آ گیا۔ ایک پاؤں پر زور دے کر بڑے بڑے قدم اٹھا کر گلی کے کونے میں غائب ہوتا ہوا۔ گلی میں جلنے والے بلب کی روشنی میں اس کا دراز قد کتنا نمایاں ہو رہا تھا اور پتا نہیں اس نے مجھ سے کیا باتیں کرنا تھیں سوچتے سوچتے جانے کب وہ سو گئی تھی۔

☆☆☆

تین بیڈ روم کا یہ چھوٹا سا گھر بالکل نیا بنا ہوا تھا۔

روی نے چند ہی دنوں میں گھر کو کسی حد تک فرنشڈ کرلیا تھا۔ جب وہ گڑیا اور اماں کو لے کر گھر آیا تو گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اماں کو وہ سیدھے اسپتال سے ادھر ہی لایا تھا اور پھر گڑیا کے ساتھ وہ گھر سے اپنی گڑیا اور اماں کی ضروری چیزیں لینے گیا تھا۔ ابا اپنے آفس میں تھے، گھر میں نازو تھی اور ایک نئی ملازمہ۔ نازو لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں پاؤں صوفے پر رکھے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور اس کی گود میں دھری پلیٹ ڈرائی فروٹ سے بھری ہوئی تھی اور مزے سے کھاتے ہوئے وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جونہی روی نے اندر قدم رکھا وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی تو اس کی گود سے پلیٹ نیچے کارپٹ پر گری اور کاجو، اخروٹ، بادام اور کشمش نیچے کارپٹ پر بکھر گئے۔ وہ یکدم نیچے بیٹھ کر انہیں اٹھانے لگی۔ ایک ناگواری نظر اس پر ڈالتا ہوا گڑیا کا ہاتھ پکڑے وہ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ جب ضروری سامان پیک کر کے وہ نیچے اترے تو نازو پھر پہلی پوزیشن میں بیٹھی فلم دیکھتے ہوئے کاجو کھانے جاری تھی۔ اس نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر بے نیازی سے فلم کی طرف متوجہ ہوگئی۔ سارا سامان گاڑی میں رکھ کر وہ پھر واپس آیا اور گڑیا کو نیچے لاؤنج میں ہی کھڑا کر کے وہ اوپر گیا۔ کتابوں والا بیگ اوپر ہی رہ گیا تھا۔ جب وہ بیگ لے کر نیچے آیا تو گڑیا ریلنگ پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔

"کیا ہوا گڑیا؟" بیگ آخری سیڑھی پر رکھ کر وہ تیزی سے گڑیا کی طرف لپکا۔

"کیا نازو نے کچھ کہا؟" اس نے گھور کر نازو کی طرف دیکھا۔ جو ایک بار پھر بوکھلا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

"نہیں۔" گڑیا نے نفی میں سر ہلایا۔ اور تیزی کے ساتھ ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے تھے۔

"بس ایسے ہی مجھے لگا روی بھائی جیسے میں ہوم سویٹ ہوم کی تیلی ہوں اور مجھے تیلی یاد آگئی تھی۔ اسے جب اپنا گھر چھوڑنا پڑا ہوگا تو اسے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ ہے نا......؟" روی نے ایک ہاتھ میں بیگ اٹھاتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ ......وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا اور اس وقت گڑیا کے دل کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں گڑیا اسے بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔ اتنی ہی تکلیف جتنی آج تمہیں ہورہی ہے لیکن کبھی کبھی اچھے مستقبل کے لیے یہ تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ آؤ......" گڑیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"اپنا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا گڑیا۔" اس کی آواز میں آنسو گھلے تھے لیکن اس کی آنکھیں شفاف تھیں۔ پورچ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے مڑ کر اندرونی دروازے کو دیکھا۔ لکڑی کا یہ بھاری منقش دروازہ انتہائی خوب صورت تھا۔ اماں نے اسے بتایا تھا کہ ان کے گاؤں کے ایک مستری جس نے ان کی حویلی میں لکڑی کا کام کیا تھا یہ دروازہ پورے چھ ماہ میں بنایا تھا۔ انتہائی خوب صورت کام تھا۔ وہ لمحہ بھر یونہی مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔

"میں اس گھر سے کبھی بھی نہیں جانا چاہتا تھا گڑیا کبھی بھی نہیں...... میں نے ہمیشہ اماں ابا اور تمہارے ساتھ ایک مکمل گھر کی دعا کی تھی لیکن کبھی کبھی دکھ برداشت کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔" وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھا تھا۔ بیگ ڈگی میں رکھ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھا ہی تھا کہ اندرونی گیٹ کھول کر تیز تیز چلتے ہوئے ابا باہر نکلے تھے۔ شاید وہ سو رہے تھے یا اپنے کمرے میں تھے اور اس نے سوچا تھا کہ وہ آفس میں ہیں۔ وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ "رکو......" وہ پورچ کی سیڑھیاں اتر کر آئے۔

"گڑیا تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔"

"کیوں......؟"

"مجھے تم پر اور اس احمق عورت پر اعتبار نہیں ہے۔"

"اور مجھے آپ پر اعتبار نہیں ہے۔" روی نے جواب دیا تھا۔ اس کے برابر بیٹھی گڑیا کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"گڑیا یہاں رہے گی اپنے باپ کے گھر۔" وہ چلائے تھے۔

"گڑیا اپنی ماں کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر رہے گی ابا جی۔ آپ کے پاس آپ کی بیوی ہے جائیے اس کی جاکر ناز برداریاں کیجیے۔" وہ تلملائے تھے۔

"تم حد سے بڑھ رہے ہو روی۔"

"سوری اگر کوئی گستاخی ہوگئی ہو تو۔"

"میں عدالت کے ذریعے گڑیا کو لے لوں گا۔"

"کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔" روی مسکرایا تھا۔ "عدالت ماں کا حق صائب مانتی ہے بچی کے لیے۔" اور پھر وہ تیزی سے گاڑی گیٹ سے نکال کر لے گیا تھا۔

نیا گھر اچھا تھا وہاں سکون تھا۔ ابا کے جھگڑے نہیں تھے لیکن اماں ٹھیک نہیں تھیں وہ جب سے اسپتال سے آئی تھیں بالکل چپ تھیں۔ جہاں بیٹھی ہوتیں وہیں بیٹھی رہتیں۔ روی اور گڑیا کوئی بات کرتے تو خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہتیں۔ کبھی کبھی ان کی نظروں میں اتنا سپاٹ پن ہوتا کہ گڑیا گھبرا کر رونے لگتی۔ وہ جیسے اپنے ارد گرد سے بے خبر ہو جاتیں۔ روی انہیں مختلف ڈاکٹروں کے پاس لیے پھرتا۔

"دراصل یہ سائیکولوجیکل شاک کی کیفیت ہے۔" ڈاکٹر عمر نے کہا تھا۔ "وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس شاک سے نکل آئیں گی۔ اس میں کچھ وقت لگ جائے گا۔"

"اندازاً کتنا......؟"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا، کم بھی ہوسکتا ہے زیادہ بھی......" کبھی کبھی وہ بالکل نارمل لگتیں لیکن زیادہ تر وہ چپ رہتی تھیں۔

"انہیں تنہا مت رہنے دیا کریں، ان سے باتیں کیا کریں۔ بھلے وہ جواب دیں یا نہیں۔ زندگی کی سرگرمیوں میں انہیں انوالو کریں۔"

ہولے ہولے وہ گھریلو امور میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ کبھی پیاز کاٹ دی، کبھی ایسا ہی چھوٹا موٹا کام...... روی نے گھر کے لیے ملازمہ کا بندوبست کردیا تھا۔ وہ جب بھی فارغ ہوتا اماں اور گڑیا کو آؤٹنگ پر لے جاتا۔ کبھی اماں کا موڈ نہ ہوتا تو وہ صرف گڑیا کو لے جاتا۔ ان دنوں گڑیا فارغ تھی اور اس نے اس کے ساتھ جاکر بے شمار کتابیں خریدی تھیں۔ روی کو اماں کی بہت فکر تھی۔

"اماں کچھ بولا کریں نا۔"

"کیا بولوں؟" بہت کم وہ جواب دیتیں۔

"کچھ بھی اماں......" وہ ان کا ہاتھ تھام لیتا۔

"جو آپ کے دل میں ہے۔"

"میرے دل میں......" وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگتیں۔

"ہاں آپ کا کیا جی چاہتا ہے اماں......؟ مجھے بتائیں نا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا دیتیں۔ وہ پریشان ہو جاتا گڑیا رونے لگتی۔ لیکن ڈاکٹر عمر بہت پُر امید تھے۔

"وہ بات تو کرتی ہیں نا کبھی کبھی۔ یہ خوش آئند ہے۔"

ایک دن چوبیس گھنٹے کی مسلسل بے ہوشی کے بعد وہ ہوش میں آئی تھیں۔ تب روی ان کے پاس اسپتال میں ان کے بیڈ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ نہیں تھے۔

"کوئی شدید ذہنی شاک......؟" ڈاکٹر عمر نے روی سے استفسار کیا تھا۔

"پتا نہیں کون سا صدمہ زیادہ شدید تھا۔" روی نے سوچا تھا۔ "ان کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کا صدمہ...... یا پھر ان کی ملازمہ کو ان کی سوکن بنا کر سامنے لا کھڑا کرنے کا صدمہ......"

"اپنے پیشنٹ کا علاج کرنے کے لیے ڈاکٹر کو پیشنٹ کے حالات جاننا ضروری ہوتا ہے۔ جب ہمیں اس ذہنی شاک کا پس منظر پتا چلے گا تو ہمارے لیے آسانی ہوگی کیپٹن۔" تب روحی نے مختصراً ابا کی دوسری شادی کے متعلق ڈاکٹر کو بتا دیا تھا۔

"ہم پوری کوشش کریں گے لیکن آپ کو بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا تاکہ یہ اس کیفیت سے نکل آئیں۔" روحی کسی ننھے بچے کی طرح اماں کا خیال رکھتا۔ کبھی کبھی نوالے بنا کر خود انہیں کھلاتا۔ اکثر انہیں اور گڑیا کو آؤٹنگ کے لیے لے جاتا۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ کافی امپروو کر رہی ہیں۔ وہ بولتی نہیں تھیں لیکن ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے سے ان کے احساسات کا اظہار ہوتا۔ گڑیا کے میٹرک کا رزلٹ گلبرگ کے اس گھر میں آنے کے چند دن بعد ہی آگیا تھا۔ تب روحی انہیں باہر لے گیا تھا۔ اس نے گڑیا کو خوب صورت کتابوں کا سیٹ تحفے میں دیا تھا۔ تب اس روز اماں کے چہرے سے بھی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ گڑیا کالج جانے لگی تھی۔ گھر میں ایک مستقل ملازمہ روحی نے رکھ لی تھی جو اس کے یونٹ کے کسی حوالدار کی عزیزہ تھی۔ وہ بیوہ تھی اور آگے پیچھے کوئی نہیں تھا سوائے ایک بیٹے کے جو ماں سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ حوالدار اسے گاؤں سے لے آیا تھا۔ اس کے آنے سے روحی بہت مطمئن ہو گیا تھا۔ جب گڑیا کالج جاتی اور وہ اپنے یونٹ میں تو عذرا بی بی کے ہونے سے اسے کوئی فکر نہیں ہوتی۔ عذرا بی بی نے بھی اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھا تھا۔ گڑیا اور روحی انہیں خالہ جی کہہ کر بلاتے تھے۔

ابا اور نازو کیسے تھے۔ کس طرح کی زندگی گزار رہے تھے گڑیا نہیں جانتی تھی۔ اسے ابا کی پسند پر حیرت ہوتی تھی اور وہ سوچتی تھی کہ کیا ابا نازو پر بھی یونہی چلاتے ہوں گے جیسے اماں پر چلاتے تھے۔

"شاید...... اور شاید نہیں......" ایک روز اس نے روحی سے پوچھا تھا۔

"دراصل ابا خود پرست تھے بلکہ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ پرفیکٹ ہیں حالانکہ اس دنیا میں کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ہے۔ کامل ذات تو صرف اللہ کی ہے۔" روحی نے اسے سمجھایا تھا۔

ان دنوں روحی کو اسلامی کتب کے مطالعے کا بھی بہت شوق ہو گیا تھا۔ وہ خود خریدنے کے علاوہ آرمی کے میس سے بھی کتابیں پڑھنے کے لیے لاتا رہتا تھا۔

"دراصل ابا خود کو دنیا کا حسین ترین مرد سمجھتے ہیں اور ذہین ترین بھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے لیے بیوی بھی ایسی ہی ہونا چاہیے لیکن جب ایک رشتے کی بھالی لڑکی سے ان کی شادی ہوگئی جسے انہوں نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی اور جو ان کی نظر میں ایک عام سی کم علم لڑکی تھی تو ان کی خود پسندی اور خود پرستی نے اپنی انا کی تسکین کا یہ راستہ اپنایا...... اماں کی عزت نفس مجروح کر کے وہ اپنے نفس کی تسکین کرنے لگے تھے۔"

"تو انہیں تو کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت تھی نا روحی بھائی۔" گڑیا کے لبوں سے نکلا تھا۔

"ہاں، اچھا خیال ہے، کسی روز ملے تو میں انہیں ضرور مشورہ دوں گا۔"

"لیکن آپ نے میری بات کا جواب تو دیا ہی نہیں۔"

"کیا بھلا......؟"

"وہ نازو......"

"وہ تو دیا کہ شاید ہاں شاید نہیں لیکن ایک بات طے ہے بیٹا کہ ابا کی نازو سے نبھے گی نہیں۔"

یہ روحی کا خیال تھا جبکہ گڑیا سوچتی تھی کہ ابا اور نازو مزے سے زندگی گزار رہے ہوں گے۔

اس روز وہ اماں کو معمول کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر عمر اماں کی امپروومنٹ پر بہت خوش تھے۔

"اب یہ اپنے اردگرد کے ماحول میں دلچسپی لینے لگی ہیں اور اپنے اطراف کو محسوس کرنے لگی ہیں۔

بہت جلد انشاءاللہ یہ نارمل لائف کی طرف واپس آجائیں گی۔ بعض اوقات چوٹ اس زاویے سے لگتی ہے کہ ان بریک ایبل گلاس بھی کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ اکثر مرد شادی کر لیتے ہیں دوسری عورتیں برداشت کر لیتی ہیں لیکن آپ کی اماں برداشت نہیں کر سکیں۔" اس روز وہ واپسی پر بہت خوش تھے۔

"اماں نارمل ہو گئیں تو میں ایک بہت بڑی پارٹی دوں گا۔ تم بھی اپنی سہیلیوں کو بلانا سب کو...... جتنی بھی ہوں۔ دس پندرہ بیس پچاس......" وہ مسکرایا تھا۔

"لیکن میری تو ایک سہیلی بھی نہیں ہے روحی بھائی......"

"ارے ایک سال میں تم نے کوئی سہیلی نہیں بنائی کالج میں۔" یہاں اس گھر میں آئے انہیں ایک سال ہونے والا تھا۔

"نہیں۔"

"کیوں نہیں۔"

"پتا نہیں بس میں آج تک کوئی سہیلی بنا ہی نہیں سکی۔"

"تو چلو آج سے میں تمہاری سہیلی بلکہ سہیلا۔"

"روحی بھائی آپ......" وہ ہنسی تھی۔ وہ اس سے گیارہ سال بڑا تھا اور اس کے ساتھ بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا بلکہ کبھی بیٹا کہہ کر بھی بلا لیتا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا خود کو اور بھی بزرگ اور بڑا سمجھنے لگا تھا۔

"کیوں، میں اچھی سہیلی نہیں بن سکتا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ "یا تم مجھے سہیلی بنانا نہیں چاہتیں۔"

"نہیں تو...... آپ تو بہت اچھے ہیں روحی بھائی۔ لیکن سہیلیوں کے ساتھ ہر بات شیئر کی جاتی ہے...... تو آپ کے ساتھ کیسے شیئر کروں گی۔"

"بھئی جیسے سہیلیوں کے ساتھ کرتی ہو ویسے ہی میرے ساتھ کر لینا۔ آخر تم اپنے روحی بھائی کے ساتھ بھی اپنی باتیں شیئر کرتی ہو نا اپنے ٹیچرز کی اپنی......"

"ہاں۔ تو اب روحی بھائی...... بھائی کے ساتھ دوست بھی بن جائیں گے...... ٹھیک۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور روحی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ اس رات اپنے بیڈ پر لیٹنے کے بعد اس نے اماں کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا تھا۔

"روحی بھائی دنیا کے سب بھائیوں سے اچھے بھائی ہیں۔ بالکل "روزلی" کے بھائی جیسے۔ اسے روزلی اور اس کے بھائی رچ کی کہانی بھی بہت پسند تھی اور رچ بھی روزلی کو رات سونے سے پہلے کہانیاں سناتا تھا۔

روزلی جو چھ سال کی تھی تو اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہوگئی تھی اور روزلی رچ کے ساتھ چھ ماہ اپنے باپ کے ساتھ اور چھ ماہ ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

"نہیں۔" اس نے جھرجھری سی لی تھی۔ کتنے دنوں بعد آج پھر وہ روزلی کے لیے چپکے چپکے روئی تھی اور روحی کہتا تھا وہ کہانیوں میں خود کو اتنا انوالو نہ کرے۔ کہانی تو کہانی ہوتی ہے لیکن کہانی حقیقت سے ہی تو جنم لیتی ہے یا پھر کبھی کبھی کہانی حقیقت میں ڈھل جاتی ہے۔

اور پھر اگلے کئی دن روٹین ہی کے گزرے۔ وہی کالج جانا۔ اماں اور روحی کو کالج کی ہر بات بتانا۔ خالہ جی کے ساتھ کچن میں ان کا ہاتھ بٹانا۔ روحی کے ساتھ کبھی کبھی آؤٹنگ کے لیے جانا، کبھی اماں کے ساتھ اور کبھی اکیلے۔ جب وہ اکیلے جاتے تو بانو بازار کی چاٹ کھانے ضرور جاتے اور پھر واپسی پر پرانی کتابیں چھانتے، کبھی کبھی بہت اچھی کتابیں مل جاتی تھیں۔

اس روز بھی وہ فیروز سنز سے نکلے تھے۔ اماں گھر پر تھیں اور روحی کو اپنے لیے کتابیں خریدنی تھیں۔

وہ کتابیں خرید کر باہر نکلے تو روحی کو کیپٹن حنان مل گئے۔

"ارے تم یہاں؟" کیپٹن حنان نے پوچھا

تھا۔

"بس کچھ کتابیں لینے نکلا تھا۔ یہ میری چھوٹی بہن ہے۔" کیپٹن عثمان نے مسکرا کر اسے وش کیا تھا۔

"یار کبھی لاؤ نا اپنی مدر اور سسٹر کو ہمارے گھر۔"

"ضرور۔"

وہ تینوں پارکنگ کی طرف جا رہے تھے۔ عثمان اور روی ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھے جب اس نے ایک گاڑی سے ابا اور نازو کو اترتے دیکھا تھا۔ شاید ابا نے نئی گاڑی لی تھی۔ اس نے گاڑی کا ماڈل دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ عین اسی وقت نازو کی نظر اس سے ملی تھی۔ یہ وہ ڈیڑھ سال پہلے والی نازو تو نہیں تھی۔ اس نے سلیقے سے میک اپ کیا ہوا تھا اس کے جسم پر بیش قیمت شیفون کا کسی اچھے بوتیک سے خریدا ہوا سوٹ آج اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی سانولی رنگت پر سلیقے سے کیا گیا میک اپ اسے دلکش بنا رہا تھا۔ نازو نے مڑ کر ابا سے کچھ کہا تھا۔ ابا نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ نازو چپکے چپکے کچھ کہہ رہی تھی اور ابا پتا نہیں کیوں غصے میں لگ رہے تھے۔ جانے نازو ان سے کیا کہہ رہی تھی۔ ان سے نظریں ہٹا کر اس نے روی کی طرف دیکھا تھا۔ روی کیپٹن عثمان کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ عثمان نے روی سے ہاتھ ملانے کے بعد اسے مخاطب کیا تھا۔

"گڑیا...... آپ ضرور آیئے گا۔ یہ آپ کا بھائی تو ہملکو ہے گھر میں آپ کی بھابی کے علاوہ میری بھی چھوٹی بہن ہے، آپ ان سے مل کر خوش ہوں گی۔" وہ مسکرا دی تھی۔

نازو کے ساتھ کھڑے حبیب خان بہت غصے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا لیکن نازو نے ایک ادا سے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر روک دیا تھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گڑیا نے نازو کو نہایت لگاوٹ سے ابا کو دیکھتے اور ان کے بازو پر ہاتھ رکھے دیکھا تو اس کا دل جیسے اندر ہی اندر رو پڑا۔ اس نے اس منظر میں اپنی پسند کے رنگ بھرنا چاہے تھے۔ اماں، ابا کے بازو پر ہاتھ رکھے کھڑی اور ان کی طرف محبت سے دیکھتے ابا لیکن وہ اس منظر کو اپنی پسند کے منظر میں تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ تب ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"ارے کیا ہوا گڑیا۔" عین روڈ پر آتے ہی روی کی نظر اس پر پڑی تھی اور اس کا اتنا پوچھنا غضب ہو گیا تھا۔ گڑیا کے آنسو روانی سے اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

"وہاں پارکنگ میں ابا تھے اور نازو۔"

"سو واٹ؟" روی نے کندھے اچکائے تھے۔ "اپنے آپ کو مضبوط بناؤ گڑیا۔ اسی ایک شہر میں رہتے ہوئے تم کئی بار کئی مقامات پر ابا اور نازو کو دیکھو گی تو کیا ہر بار اسی طرح روؤ گی وہ ہمارے باپ ہیں۔ ہمارا یہ رشتہ ہمیشہ ان سے رہے گا۔ یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ چاہے وہ دس شادیاں کیوں نہ کر لیں...... مجھے ابا کے شادی کرنے کا افسوس نہیں ہے گڑیا۔ ہاں انہوں نے اماں کی قدر نہیں کی مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ جب میں اماں کو ساتھ لے آؤں گا تو ابا کو مشورہ دوں گا کہ وہ کسی اچھے اسٹینڈرڈ کی ایسی لڑکی سے شادی کر لیں جس سے شادی کرنا ان کا خواب تھا اور اماں پر اپنا غصہ نکالنا بند کر دیں لیکن انہوں نے نازو سے شادی کر لی۔ مجھے اس کا بے حد صدمہ ہے۔ ان کے اپنے معیار سے اتنے گر جانے کا دکھ ہے۔ انہوں نے اماں پر نازو کو ترجیح دی، مجھے اس کا صدمہ اور رنج ہے اور شاید اماں کو بھی جو شاک لگا ہے اسی وجہ سے...... وہ کسی خاندانی لڑکی سے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی بہت خوب صورت ہوتی ان کے مقابلے کی ہوتی اس سے شادی کرتے تو شاید اماں کو اتنا صدمہ نہ ہوتا کیونکہ انہوں نے خود ابا کو کئی بار کہا تھا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کر لیں۔ ان کی طرف سے اجازت ہے۔"

یہ روی...... کے خیالات تھے۔ گڑیا کو اس بات کا بہت دکھ ہوتا خواہ ابا کسی سے بھی شادی کرتے وہ ابا کے ساتھ صرف اماں کو دیکھنا چاہتی تھی، خوش اور مطمئن...... اور اس کے لیے اب بھی اللہ میاں سے دعائیں مانگتی تھی، کہانیوں کی طرح کوئی جادو کی چھڑی ہو جسے وہ گھمائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ ابا ایک ظالم حکمران سے نرم دل اور رحم کرنے والے ہمدرد انسان بن جائیں اور ان کا گھر امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔

لیکن زندگی کہانی نہیں ہے۔ روی سچ کہتا تھا۔ جہاں انسان اپنی مرضی سے حالات و واقعات کو بدل لے۔ اس روز سونے کے بعد بھی خواب میں وہ ابا اور نازو کو دیکھتی رہی تھی۔ صبح جب وہ اٹھی تو اماں اپنے بستر پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔

"اماں جی۔" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی پیشانی کو چوم لیا۔ "اماں جی آپ نماز پڑھیں گی؟"

"ہاں۔" وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"تم بھی پڑھ لو۔"

"جی اماں۔" وہ خوشی سے روی کے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ "روی، روی بھائی اماں نے مجھے نماز پڑھنے کے لیے کہا اور وہ خود بھی نماز پڑھنے لگی ہیں۔"

اس روز وہ کالج میں بھی بہت خوش رہی تھی لیکن کبھی کبھی خوشی کتنی مختصر ہوتی ہے۔ وہ کالج سے آئی تھی اور ابھی کھانے کے لیے ٹیبل پر بیٹھی تھی کہ باہر گیٹ پر بیل بجی۔

روی آج جلدی آ گیا تھا۔ وہ اماں اور اس کے ساتھ ابھی ٹیبل پر آ کر بیٹھا تھا۔ خالہ جی بھی کھانا لگا کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ روی کا حکم تھا کہ خالہ جی بھی ان کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھائیں گی۔

"آپ ہمارے گھر کی ہی ایک فرد ہیں۔ آپ کو کیا پتا خالہ جی ہم کسی بزرگ کے لیے کتنا ترسے ہیں۔" بیل کی آواز پر خالہ جی کھڑی ہو گئیں۔

"میں دیکھتی ہوں۔"

"آپ بیٹھیں خالہ جی میں دیکھتا ہوں۔" روی اٹھ کر باہر گیا۔ جب وہ کچھ دیر تک واپس نہیں آیا تو اماں نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"روی۔" ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے پہلی بار اماں نے روی کا نام لیا تھا۔ ڈاکٹر عمر سچ کہتے تھے اماں بہت جلد نارمل ہو جائیں گی۔

"میں دیکھتی ہوں اماں۔" وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی، پھر جب وہ اندرونی گیٹ کھول کر باہر آئی تو گیٹ کے پاس ابا اور روی کھڑے تھے اور روی کہہ رہا تھا۔

"ابا میں نے آپ سے کہہ دیا ہے نا کہ گڑیا آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔"

"کیسے نہیں جائے گی۔" روی کی آواز آہستہ تھی لیکن ابا کی آواز بہت بلند...... وہ وہیں دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ابا کی نظر اس پر پڑی تھی۔

"میں اسے زبردستی لے جاؤں گا روی۔ میں اسے تمہارے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ تم جس طرح اپنی ماں......"

"اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہیے گا ابا ورنہ......"

"ورنہ کیا......" ابا اس بار اپنے پرانے انداز میں دہاڑے تھے اور گڑیا کو لگا تھا وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑی نہیں رہ سکے گی۔

"میں نے خود دیکھا ہے تمہارے ساتھ ایک اجنبی مرد کو جو ہنس ہنس کر گڑیا سے باتیں کر رہا تھا اور تم......"

"ابا پلیز اتنا مت گریں کہ آپ سے نفرت ہو جائے۔ وہ میری یونٹ کا ہی ایک کیپٹن ہے اتفاقاً مل گیا تھا۔"

"جو بھی ہو میں گڑیا کو یہاں چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ گڑیا۔" انہوں نے اسے پکارا اور ایک قدم آگے بڑھایا لیکن روبی نے بازو آگے کر کے انہیں روک دیا۔

"آپ یہاں سے چلے جائیں ابا ۔۔۔ ورنہ میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں گی۔" اور گڑیا یکدم بھاگ کر اندر چلی گئی تھی۔ پھر پتا نہیں روبی نے کیسے انہیں واپس کیا تھا۔ وہ تو اندر جا کر اماں کے گلے لگ کر رونے لگی تھی۔ اماں حیران سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ روبی نے اندر آ کر اماں کو تسلی دی۔

"بالکل پاگل ہے اماں جی، ذرا سی آہٹ پر بھی ڈر جاتی ہے۔" اماں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چومی تھی اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"پریشان مت ہو نا گڑیا ۔۔۔ ابا تمہیں یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔" رات کو اپنے کمرے میں جانے سے پہلے روبی نے اسے تسلی دی تھی لیکن پھر بھی اگلے تین چار دن تک وہ بہت پریشان سی رہی۔ گیٹ پر بیل ہوتی تو اس کا رنگ زرد ہو جاتا۔ دو دن وہ کالج بھی نہیں گئی۔ پتا نہیں ابا کو گھر کا ایڈریس کہاں سے ملا تھا۔ وہ سوچتی۔ روبی کو پتا چلا تو وہ حیران ہوا۔

"گڑیا تم کالج کیوں نہیں جا رہی ہو؟"

"ڈر لگتا ہے۔"

"کس سے؟"

"ابا سے ..... کہیں وہ مجھے۔"

"پگلی ایک فوجی کی بہن ہو کر ڈرتی ہو اور ابا کچھ نہیں کر سکتے نہ وہ تمہیں زبردستی لے جا سکتے ہیں اور نہ ہی عدالت کے ذریعے۔" روبی کے بے حد تسلی دینے پر کہیں اس کا دل ٹھہرا تھا اور وہ معمول کے مطابق کالج جانے لگی تھی۔

صبح تو ہمیشہ وہ روبی کے ساتھ جاتی تھی لیکن واپس اکیلے ہی پیدل آ جاتی تھی۔ کالج ان کے گھر سے نزدیک ہی تھا۔ اگرچہ اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے کسی بھی بہترین کالج میں ایڈمیشن مل سکتا تھا لیکن روبی نے اس خیال سے اسے وہاں ایڈمیشن نہیں دلوایا تھا کہ اس کی ہوسٹنگ ایسی جگہ ہوگی جہاں وہ انہیں نہ لے جا سکتا ہو تو پھر گڑیا کے لیے کسی دور کے کالج میں اکیلے جانا مشکل ہوگا۔ سو یہ گرلز انٹر کالج اس کے گھر کے نزدیک ہی تھا جہاں وہ پیدل بھی جا سکتی تھی۔ ایف۔ ایس۔ سی کے بعد اس میں ذرا کانفیڈنس پیدا ہو جائے تو پھر بی ایس سی وغیرہ کسی اچھے کالج سے کرے گی۔ یہ روبی نے سوچ رکھا تھا اور گڑیا کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا۔ ابا کی طرف سے بے حد مطمئن ہو کر وہ پھر سے کالج جانے لگی تھی۔ اس روز واپسی پر وہ روڈ کراس کر کے اپنے گھر والی گلی کی طرف مڑی تھی۔ ان کا گھر روڈ پر نہیں تھا بلکہ اندر ایک گلی میں تھا۔ وہ اپنے دھیان میں مگن جا رہی تھی کہ یکدم ابا نے پیچھے سے آ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"چلو میرے ساتھ۔"

"نہیں۔" وہ چیخی۔

"میں کہہ رہا ہوں سیدھی طرح چلو ورنہ کھینچتا ہوا لے جاؤں گا۔"

"نہیں ۔۔۔ خدا کے لیے نہیں۔" وہ رونے لگی تھی۔ گلی میں آس پاس کوئی نہیں تھا سوائے دو بچوں کے جن کا دھیان اس بال کی طرف تھا جسے وہ اچھالتے ہوئے جا رہے تھے۔

"ہنگامہ مت کرو ورنہ بدنامی ہوگی تمہاری۔" وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بے آواز روئے جا رہی تھی اور وہ تقریباً اس کے بازو کو دبوچے اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ ان کی نئی گاڑی گلی کے کنارے پر کھڑی تھی۔ انہوں نے ڈرائیور کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا اور خود اسے اندر دھکیلتے ہوئے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی فراٹے سے گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی اور وہ شدید خوفزدہ ہو کر اونچا اونچا رونے لگی تھی۔

باقی آئندہ

ناولٹ

کوئی شہر ایسا بسا آؤ من میں!

نگہت سیما

تیسرا حصہ

سیمل صبح اٹھی تو اس کا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھیں۔ جانے رات وہ کب سوئی تھیں۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹی تھی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ اس نے انہیں نہیں جگایا۔ نماز پڑھ کر اس نے چائے بنائی اور باہر تخت پر آکر بیٹھ گئی۔ اندر کے مقابلے میں اس وقت باہر کا موسم بہت اچھا تھا۔ فضا میں خنکی تھی اور سامنے درختوں پر چڑیوں کا شور تھا۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے وہ کتنی ہی دیر تک جامن کے درخت پر چڑیوں کو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتے ہوئے دیکھتی رہی۔ چڑیوں کو دیکھتے اور گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر نوشیرواں کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

”اگر مروان ہوتا تو یقیناً نوشیرواں سے مل کر خوش ہوتا۔“

چائے کا خالی کپ کچن میں رکھ کر وہ اپنا موبائل، قلم اور ڈائری لے کر پھر تخت پر آ بیٹھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے مروان سے بات کیے۔

”اور اگر انہوں نے مجھے پھر دیکھ لیا تو......“ اس نے جھرجھری سی لی۔

”اور اگر نوشیرواں نہ ہوتا تو وہ ...... مجھ تک پہنچ جاتے۔ زبردستی مجھے لے جاتے تو......

پھر

اماں کا کیا ہوتا مروان۔ پتا ہے مروان یہ جو نوشیرواں ہے نا کل اگر میرے ساتھ نہ ہوتا تو وہ ضرور مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ ڈاکٹر عرفان کہتے ہیں اس ایک ماہ میں اماں نے جو ردِعمل ظاہر کیا ہے وہ بہت پُرامید ہے۔ ہم نے کتنی دعائیں کی تھیں نا اماں کے لیے کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔ ہماری ہر خوشی کتنی ادھوری ادھوری سی ہوتی تھی۔ جب ڈاکٹر عمر ہمیں ڈھارس دیتے تھے ہمارا حوصلہ بڑھ جاتے تھے اور اب ڈاکٹر عرفان ہیں...... لیکن مروان بعض دعائیں اتنی دیر سے کیوں قبول ہوتی ہیں کہ ان کی قبولیت کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔ آپ بھی ہوتے یہاں تو یہ خوشی کتنی مکمل ہوتی۔

پتا ہے رات اماں نے میرے آنسو پونچھے میرا سر دبایا......

نہیں، میں اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں روتی لیکن رات یوں لگا تھا جیسے سارے زخموں کے ٹانکے ایک ساتھ کھل گئے ہوں۔ پتا ہے نوشیرواں نے کہا تھا کہ آپ مروان کو کیوں نہیں بلا لیتیں۔ آپ کو اور اماں کو ضرورت ہے ان کی اور تب نوشیرواں کی بات سن کر مجھے بہت رونا آیا تھا۔ اپنی بے بسی پر آپ کے نہ آسکنے پر اور پھر آپ مجھے بہت یاد آرہے تھے مروان۔ بہت زیادہ......

میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے کیپٹن حسام کو بھی دیکھا تھا۔ ماتھے پر دایاں ہاتھ رکھے سامنے دشمن کے سپاہیوں کی نقل و حرکت کو دیکھتا وہ سجیلا کپتان جس کے ارد گرد نور کا ہالہ سا بنا تھا...... شہادت کا نور۔

کبھی کبھی میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں کیپٹن حسام کے گھر جاؤں، ان کی بیوی اور بچوں سے ملوں لیکن اکیلے کیسے جاؤں آپ ہوتے تو......

اور میں تو کہیں بھی نہیں جاتی مروان سوائے یونیورسٹی کے اور وہ بھی حسنہ کے کہنے پر۔

حسنہ یاد ہے نا آپ کو جو گن آباد والے اس گھر میں آنے کے بعد میری دوست بنی تھی۔ میری پہلی دوست ......اس

ہی سوئی ہوگئی۔

"چلو اچھا ہوا، کیا خبر وہ پھر وہاں آئے ہوں اور ان سے کچھ بعید بھی نہیں۔ میں شام کو جا کر نوشیرواں کو اس کی ڈکی دے آؤں گی اور رات کی ان کی کیفیت بھی بتا دوں گی اور پھر نوشیرواں نے مجھ سے بات بھی تو کرنا تھی اور پتا نہیں کیا بات؟" ایک لمحے کے لیے اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ اس نے میراں اماں کی طرف دیکھا۔ میراں اماں دیوار کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ اس نے واپس مڑ کر اپنا سامان اٹھایا تب ہی دروازے پر بیل ہوئی۔ فضیلت آئی تھی۔

"تم نے اتنی دیر کر دی فضیلت اگر مجھے یونیورسٹی جانا ہوتا تو اماں پیچھے اکیلے کیسے رہتیں؟"

"وہ جی بس کوئی ایمرجنسی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ... اماں کو چھوڑ دیں گی میراں اماں کی طرف۔"

"تمہیں ہر مسئلے کا حل میراں اماں ہی نظر آتی ہیں۔" وہ جھنجلائی تھی لیکن پھر فوراً ہی نارمل ہوگئی۔

"ٹھیک ہے جاؤ، کچن صاف کر کے اماں کے لیے ناشتا بناؤ، ایک کپ چائے میرے لیے بھی بنا دینا۔" بہرحال فضیلت کے دم سے اسے بڑا آسرا تھا اور یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ فضیلت دیر سے آئی تھی۔ ورنہ ابھی وہ تیاری ہو رہی ہوتی تھی کہ فضیلت آ جاتی تھی۔ تخت پر سے اپنی چیزیں سمیٹ کر وہ کمرے میں آئی تو اماں جاگ کر بیٹھ چکی تھیں کچھ پریشان سی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا ہو۔

"اماں جی آپ جاگ گئیں؟" ان کے قریب جا کر پیشانی پر بکھرے ان کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے کرتے ہوئے اس نے بے حد محبت سے پوچھا۔ اماں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔ اماں کے اس عمل نے اسے حیران کیا لیکن وہ مسکرا دی۔

"اماں چلیں آپ کا منہ ہاتھ دھلوا دوں جب تک فضیلت ناشتا بنا کر لاتی ہے..... پھر ہم دونوں اکٹھے ناشتا کریں گے۔ آج میں نے یونیورسٹی سے چھٹی کی ہے۔ آج ہم خوب باتیں کریں گے۔" اماں کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ انہوں نے بغیر اس کے کہے نیچے اتر کر چپل پہنی اور واش روم کی طرف چل دی تھیں۔ وہ حیرت سے کھڑی انہیں واش روم کی طرف جاتے دیکھ رہی تھی پھر بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

"مروان..... مروان ڈاکٹر عرفان سچ کہتے ہیں اماں ریکور کر رہی ہیں۔" کتنے سال گزر گئے.... اماں نے کبھی خود سے اٹھ کر کوئی کام نہیں کیا تھا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر واش روم لے جاتی تو چلی جاتیں۔ کھانا سامنے رکھ کر کھانے کو کہتی تب بھی بیٹھی رہتیں اور خالی خالی نظروں سے کھانے کو دیکھتی رہتیں۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے دیتی تو ایسے ہی پڑے رہتے جب تک خود نہ بدلواتی وہ یونہی بیٹھی رہتیں۔

"تو..... تو کیا..... سچ مچ اماں..... یا اللہ تیرا شکر ہے۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کچھ امید تو بندھی کچھ آس تو ہوئی کہ ایک دن اماں بالکل نارمل ہو جائیں گی۔" وہ اماں کے بیڈ پر ہی بیٹھ کر ان کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

"آج سارا دن اماں سے خوب باتیں کروں گی اور رات کو پارک بھی لے کر جاؤں گی۔" وہ اماں کے بیڈ پر بیٹھ کر پلان بناتی رہی اور اماں خود ہی منہ ہاتھ دھو کر آ گئیں پھر فضیلت ناشتا لے آئی تو ناشتا کر کے اس نے اماں کے کپڑے نکال کر انہیں چینج کرنے کے لیے دیے۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اماں خود سے کپڑے بدلتی ہیں یا نہیں لیکن اماں ایک بار پھر چپ سی خالی خالی نظروں سے کپڑے دیکھ رہی تھیں۔

"اماں جی یہ کپڑے بدل لیں آپ۔" اس نے

نے میرے ساتھ ہی بی اے میں ایڈمیشن لیا تھا اور وہ آپ سے بہت متاثر تھی۔ جن دنوں آپ آتے تو وہ ہمارے گھر کے بہت چکر لگاتی تھی۔ اگرچہ اس نے کبھی کہا نہیں لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ آپ کو بہت زیادہ پسند کرنے لگی تھی اور میں نے بھی سوچا تھا کہ جب بھی گھر میں آپ کی شادی کا ذکر ہوا تو میں حمنہ کا نام لوں گی۔ حمنہ نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے مروان... پہلے حمنہ اور اب میراں اماں اور نوشیرواں.....

اور یہ جو نوشیرواں ہے، اس کا ایک ماموں زاد بھائی ہے جو لاپتا ہے گیارہ مہینے سے ..... اور پتا نہیں یہ لاپتا افراد کہاں ہیں؟ ایسے بہت سارے لوگ ہیں مروان جن کے گھر والے، بچے، مائیں، بیویاں، بہنیں ہر رات دعائیں مانگ کر سوتی ہیں کہ صبح کا سورج شاید ان کے لیے کوئی خوشخبری لے کر آئے شاید بچھڑوں سے ملاقات کا سندیسہ لے لیکن سورج پھر ایک نئی امید کی کرن انہیں تھما کر غروب ہو جاتا ہے۔ زندگی کچھ زیادہ ہی مشکل لگنے لگی ہے اور مجھے وہ نظم بہت یاد آتی ہے مروان جو اکثر آپ گنگنایا کرتے تھے۔ جب ہم سن آباد والے اس گھر میں آئے تھے تو یہاں اس تخت پر ہاتھوں کا تکیہ بنائے آپ لیٹے ہوئے تھے اور آپ کے ہاتھوں میں ایک میگزین تھا۔ میں کچن سے باہر آئی تو آپ نے مجھے بلایا تھا یاد ہے نا۔

"ارے سنو فرینڈ ایک بہت پیاری نظم ہے محسن نقوی کی۔

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی ایسا شہر بساؤں میں
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں چاند ماند نہ ہو کبھی

ان دنوں کیسے خواب دیکھتے تھے ہم ..... ایک "یوٹوپیا" تھا جس میں ہم رہ رہے تھے تم مروان سے باتیں کرتے ہوئے اسے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا تھا سورج سامنے دیوار کے اوپر سے جھانک رہا تھا اور اپنی کرنیں صحن میں پھیلا رہا تھا۔

"بیٹی بچہ....." میراں اماں نے دیوار پر سے آواز دی تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"جی اماں!" وہ تخت سے اتر کر صحن کی دیوار کے پاس گئی۔

"بچہ خیریت ہے! شیری بتا رہا تھا آج تم یونیورسٹی نہیں گئیں۔"

"ہیں شاید کیا اسے الہام بھی ہونے لگا ہے۔" اس نے حیرت سے سوچا۔

"وہ دہی لینے گیا تھا تو بتا رہا تھا کہ حمنہ اکیلی اسٹاپ پر کھڑی تھی۔"

"جی!" وہ حیرت کے جھٹکے سے باہر آئی۔ "بس یوں ہی سستی ہو رہی تھی۔"

"اچھا اچھا..... شکر اللہ کا!" میراں اماں کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

"امینہ بہن بھی ٹھیک ہیں نا؟"

"جی، اماں سو رہی ہیں بس جاگنے ہی لگی تھی۔" میراں اماں نے پیچھے مڑ کر دیکھا شاید نوشیرواں نے کچھ کہا تھا پھر وہ اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بچہ شیری کہہ رہا ہے وہ کل امینہ بہن کو ڈاکٹر کی طرف لے جائے گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر نے تو اتوار کو آنے کا کہا تھا۔"

"ہاں لیکن پرسوں شیری نے جانا ہے کام سے پھر وہ پیر کو ہی واپس آئے گا تو....."

"میں لے جاؤں گی خود ہی اماں کو۔"

"نہ بچے، جب شیری ہے تو تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے اور شیری نے بات کر لی ہے ڈاکٹر سے۔" انہوں نے نوشیرواں کا پیغام نشر کیا تب وہ

کپڑوں کی طرف اشارہ کیا لیکن اماں اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ اس کی بات نہ سمجھ رہی ہوں بالکل پہلے کی طرح۔۔۔ یکدم مایوسی نے اس کے دل میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑے تو اندر کہیں نمی پھیلتی گئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی اور مسکراتے لب بھنچ گئے۔

"......؟" اماں نے دوپٹا اٹھا کر اسے دکھایا تھا۔ وہ چونکی۔

"ہاں، اماں جی یہ آپ کے کپڑے ہیں آپ چینج کریں گی نا۔" اماں کچھ نہیں بولی تھیں۔ تب اس نے ہمیشہ کی طرح ان کے کپڑے تبدیل کروائے، ان کی کنگھی کی اور ان کو میڈیسن دیں۔ دوا کھا کر وہ لیٹ گئیں اور کچھ دیر بعد وہ سو گئیں تو وہ باہر آگئی۔ فضیلت دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"فضیلت سنو اماں سو رہی ہیں، ان کا دھیان رکھنا، میں ذرا میراں اماں کی طرف جا رہی ہوں، یہ اماں کی فائل دینے۔ وہ میراں اماں کے بیٹے ہیں نا وہ کل اماں کو ڈاکٹر کی طرف لے کر جائیں گے، تم اماں کے کپڑے بدلوا کر کے انہیں تیار کر دینا۔ اگر وہ کہیں تو ساتھ بھی چلی جانا۔" فضیلت کو ہدایات دے کر وہ کرسی پر چڑھ کر میراں اماں کے گھر میں اتر گئی۔ جب وہ دوسری طرف سیڑھی سے اتر رہی تھی تو اس کی نظر نوشیرواں پر پڑی۔ وہ برآمدے میں تخت کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی پشت دیوار کی طرف تھی۔ آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور بے اختیار مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا لیکن وہ بدستور فون پر بات کر رہا تھا مگر اس کی نظریں سیمل پر تھیں جو سیڑھی سے اتر کر اب صحن میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے برآمدے کی طرف آ رہی تھی۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے فائل کو پیشانی کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ جب اس نے برآمدے میں قدم رکھا تو وہ کہہ رہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج سات آٹھ سالوں بعد لوگ کیوں یہ کہہ رہے ہیں کہ کارگل میں جو ہوا وہ حماقت تھی اور یہ کون لوگ ہیں؟ میجر عثمان فار گاڈ سیک۔۔۔" اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ "آپ تو اس طرح کے ریمارکس مت دیں۔ محض ایک ایسے صحافی کی تحریر پر جو اِدھر اُدھر سے سن کر اپنے کالم کا پیٹ بھرتا ہے کاش۔۔۔۔" یکدم دکھ اس کے لہجے میں اتر آیا تھا۔

"کاش، ہمارے صحافی اتنے ایکو اور بولڈ ہوتے کہ کچھ لکھنے سے پہلے مکمل تحقیق کرتے۔۔۔ سمندر کی تہہ میں اترے بغیر اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا میجر عثمان ۔۔۔ لیکن ہم اتنے سہل پسند ہو گئے ہیں کہ ہم بغیر تحقیق کے لکھ دیتے ہیں اور نشر کر دیتے ہیں۔ کارگل کی حقیقت سے آپ بے خبر تو نہیں میجر عثمان۔ کارگل کے برف کو رنگین بنانے والا خون حماقت نہیں تھی۔ کوئی کوشش اگر کامیاب نہ ہو سکے تو وہ حماقت تو نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کے لیے کچھ بہتر اور اچھا کرنے کی کوشش کو حماقت کہنے والے محب وطن ہرگز نہیں ہیں۔ جانے کن لوگوں نے ان کے ہاتھوں میں قلم تھما دیا ہے۔" اس کی آواز پھر بلند ہوگئی تھی۔

"ان کے منہ میں زبانیں نہیں، زہر میں بجھے تیر ہیں۔۔۔ اور ہاتھوں میں قلم نہیں خنجر ہیں۔ یہ سب لکھنے سے پہلے اس ظالم نے کیپٹن شیر خان، حوالدار لالک شہید اور ان جیسے بہت سے دوسروں کے خاندان کے متعلق نہیں سوچا جنہیں اس فخر نے ان کی جدائی کا دکھ برداشت کرنے کا حوصلہ دیا ہے کہ ان کے بیٹے شہید ہیں اور وطن کی خاطر انہوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ ان کشمیری مجاہدین کے لیے جن پر زندگی تنگ کر دی گئی تھی۔ کارگل کی جنگ کا مقصد ان کشمیری مجاہدین کو ظلم و بربریت سے نجات دلانا تھا۔ کیا یہ جرم تھا؟" وہ وہیں برآمدے کے پاس ساکت کھڑی ہوگئی

تھی۔ اس کے کانوں میں جیسے ارد گرد کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ٹی وی کی اسکرین پر چلنے والی پٹی تھی جس پر کارگل کے شہیدوں کے نام آ رہے تھے۔ فون بند کر کے نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک پاؤں برآمدے میں رکھے ساکت کھڑی تھی۔ برآمدہ صحن سے ذرا سا بلند تھا۔ سیمل کا ایک پاؤں صحن میں تھا اور دوسرا برآمدے کے کنارے پر۔

"سیمل!" حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے نوشیرواں آگے بڑھا۔

"سیمل کیا ہوا؟"

"ہاں۔۔۔" وہ چونکی اور اس نے دوسرا پاؤں بھی برآمدے میں رکھا۔ "میں یہ اماں کی فائل دینے آئی تھی۔"

"آپ ٹھیک ہیں نا؟" نوشیرواں نے فائل اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ اس کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور جانے کیوں نوشیرواں کو لگا کہ اس کی بے حد خوب صورت غزالی آنکھوں کی سطح گیلی گیلی سی تھی۔

"کون ہے شیری؟" میراں اماں کچن میں تھیں۔

"سیمل ہے اماں جان۔"

"اچھا، اچھا۔" انہوں نے کچن کے کھلے دروازے سے جھانکا۔

"سیمل بچے بیٹھو، میں یہ چاول بھگو کر آتی ہوں۔"

سیمل تخت پر بیٹھ گئی۔ نوشیرواں نے کھڑے کھڑے سرسری انداز میں فائل کھول کر دیکھی۔

"آپ نے کل یونیورسٹی جانا ہے؟"

"ہاں، ضرور بہت ناراض ہو رہی تھی کہ آج کل اتنے اہم لیکچرز ہو رہے ہیں اور میں مس کر رہی ہوں۔ دو تین دن کی تو بات ہے پھر فائنل ہو جائے گا تو۔۔۔۔"

"ہاں ٹھیک ہے سیم، آپ کو کلاسز مس نہیں کرنی چاہیے۔" وہ تخت سے کچھ فاصلے پر پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ "اور آپ کی اماں جان کیسی ہیں، رات ٹھیک رہیں؟"

اس نے صبح کا ان کا رویہ بتایا۔

"گڈ۔۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"پھر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں سیم؟"

"نہیں تو۔۔۔۔" وہ دل میں جز بز ہوئی لیکن اس نے اس کے سیم کہنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

"آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔" وہ مسکرا کر پھر سے فائل کھول کر دیکھنے لگا۔ "ڈاکٹر عرفان سے پہلے یہ کوئی ڈاکٹر عمر تھے۔"

"ہاں، جب ہم گلبرگ میں رہتے تھے تو وہاں ڈاکٹر عمر تھے اماں کے معالج۔ انہوں نے پہلے psycho trauma ہی ڈائگنوز کیا تھا لیکن پھر ان کی رائے بدل گئی تھی۔ ان دنوں اماں کافی بہتر ہو رہی تھیں بلکہ ڈاکٹر عمر کہتے تھے بہت جلد وہ اپنی حالت میں پلٹ آئیں گی اور مجھے اور مروان کو بھی لگتا تھا کہ۔۔۔۔" اس نے تفصیل بتائی۔ "پھر ہمیں یہاں آنا پڑا من آباد تو یہاں مروان، اماں کو ڈاکٹر عرفان سے چیک کروانے لگے۔"

نوشیرواں کا جی چاہا وہ پوچھے کہ ایسا کیا صدمہ پہنچا تھا اماں کو جو وہ برداشت نہیں کر سکیں لیکن پھر اس نے کچن سے باہر آتی میراں اماں کو دیکھا۔ جن کے سرخ و سپید چہرے پر صبر اور حوصلے کی تحریر رقم تھی۔ وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے آ رہی تھیں اور یہ صبر یہ حوصلہ اللہ کی دین ہے اور اللہ کے سوا کون ہے جو یہ صبر عطا کرے۔ ایک لمحے کو نوشیرواں کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔ کیسے، کس طرح لالاں نے سب

کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کیا ہوگا۔ خبریں سننا اور ذرا سی دیر کو محسوس کر لینا اور بات ہے۔ آج پندرہ، آج چالیس بندے دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ سننے والوں کے لیے یہ صرف ایک خبر ہے لیکن جن پر یہ واردات گزرتی ہے اور جو اپنے جگر گوشوں کو اپنے ہاتھوں مٹی کے سپرد کرتے ہیں...... کاش کوئی ان کا سینہ چیر کر دیکھتا۔ ان کے درد کو محسوس کرتا۔ یہ ٹی وی چینلز پر تبصرہ کرتے اینکرز، اچھل اچھل کر اور چیخ چیخ کر دہشت گردی کا احوال سناتے اگر صرف اور صرف میراں اماں کا دکھ جان پاتے تو ان کی آوازیں ان کے حلق میں ہی گھٹ جاتیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ستره لاشیں کفن میں لپٹی آ رہی تھیں...... ایک، ایک چہرہ اور صبر کا پیکر میراں اماں ایک، ایک چہرے کو چومتیں اور تڑپا جھکتا سر چٹکی...... اس نے جھرجھری سی لی۔ میراں اماں سیمل کو پیار کر رہی تھیں۔ وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ سیمل کو پیار کر کے میراں اماں نے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے بچے کھڑا کیوں ہو گیا بیٹھ — سیمل بچی سے باتیں کر تھوڑی دیر۔ میں تو بس اسے ملنے کے لیے کچن سے نکلی ہوں۔ ہانڈی چڑھا رکھی ہے بھون کر اتار لوں...... پھر آتی ہوں، اتنے تم......"

"نہیں اماں جان، آپ کام کریں میں تو بس یہ کارڈ دینے آئی تھی انہیں، کل اماں کو اسپتال لے کر جانا ہے اب چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

"نہیں بچے کچھ دیر تو بیٹھو، اچھا چل میں ہانڈی اتار آتی ہوں چولہے سے، اصل میں گرمی ہو جاتی ہے تو میں سویرے سویرے ہی کھانا بنا لیتی ہوں۔"

"جی — فضیلت بھی ناشتے کے بعد ہانڈی چڑھا دیتی ہے۔ آپ کھانا بنا لیں میں بیٹھتی ہوں۔"

"جانا نہیں بچے —" وہ اسے تاکید کر کے واپس کچن کی طرف مڑیں۔

"بیٹھ جائیں نا سیمل۔" نوشیرواں کی آنکھیں یکدم سرخ ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کون کون سے منظر آنکھوں کے سامنے آ کر انہیں لہو رنگ کر رہے تھے۔ سیمل خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میراں اماں کی شفقت و محبت اور یہ پُرخلوص اصرار — نوشیرواں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"سیمل مجھے کچھ دنوں کے لیے جانا ہے۔ ہو سکتا ہے زیادہ دن بھی لگ جائیں۔ میں تھوڑا سا آپ کی طرف سے متفکر ہوں اس روز......"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" بے اختیار ہی سیمل کے لبوں سے نکلا تھا۔

"میں وزیرستان جا رہا ہوں، جنوبی وزیرستان سے تعلق ہے ہمارا...... میراں اماں نے بتایا ہوگا۔ جنوبی وزیرستان کا سرحدی علاقہ ہے انگور اڈا —— اس کے قریب ہی ایک گاؤں ہے تورہ جاور — وہاں مجھے گل کے ایک دوست سے ملنا ہے۔ وہ اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ اتنا گہرا کہ اپنی بہت ساری باتیں جو وہ کسی سے نہیں کرتا تھا اس سے شیئر کرتا تھا۔ مجھے لگتا ہے سیمل جیسے میں اپنی فیملی کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد اس سے دور ہو گیا تھا یا وہ مجھ سے دور تھا۔ ہماری بہت کم ملاقات ہوئی تھی۔ میں میراں اماں کو لے کر لاہور آ گیا تھا اور وہ پشاور چلا گیا تھا اپنے ہاسٹل۔ آٹھ ماہ میں میری اس سے صرف دو بار ملاقات ہوئی تھی اور دونوں بار اس نے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ ان آٹھ ماہ میں وہ کیا کرتا رہا، اس کی سوچ اور فکر میں کیا تبدیلیاں ہوئیں، میں وہ سب جاننا چاہتا ہوں۔ میں اس کی تلاش کے لیے کوئی ٹھوس لائحہ عمل بنانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اس کے ان آٹھ ماہ کی دلچسپیوں اور مصروفیات سے باخبر ہوں۔ میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں ہر قیمت پر — وہ باقی رہ جانے والا میرا واحد خونی رشتہ

ہے۔ وہ مجھے بہت پیارا تھا اور ہے۔ اس کا دوست جان عالم تو، وہاں ہی رہتا ہے۔

"تورہ جاور —" وہ چونکی تھی۔ "لیکن تورہ جاور میں تو کل رات ——"

"ہاں مجھے علم ہے۔"

"تو — تو آپ نہ جائیں —" بے اختیار سیمل کے لبوں سے نکلا تھا۔ "وہاں اتنا خطرہ ہے —— اور ——" وہ یکدم پریشان ہو گئی تھی۔ نوشیرواں کی آنکھوں میں یکدم کوندا سا لپکا تھا۔

"تو —" اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ "ٹی وی پر ایک اور خبر —— اور کچھ دیر پٹی چلتی رہے گی کہ نوشیرواں عادل ——"

"نہیں۔" وہ یکدم چیخی اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"ارے، ارے آپ — میں تو مذاق کر رہا تھا۔" غیر ارادی طور پر اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹا دیے۔ سیمل کے نرم اور گداز ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں میں تھے اور سیمل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"موت تو اپنے وقتِ مقررہ پر ہی آتی ہے سیمل۔ کارگل کی بلندیوں پر جب آس پاس گولیاں گر رہی تھیں اور شہادت کی تمنا نے دل میں ہلچل مچا رکھی تھی تب وقت نہیں آیا تھا تو موت چھو کر گزر گئی تھی سو اب بھی اگر وقت نہیں آیا تو کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا اور اگر وقت آ پہنچا ہے تو یہاں اس جگہ کھڑے کھڑے بھی موت آ سکتی ہے۔" سیمل نے آہستگی سے اپنے ہاتھ کھینچے تو نوشیرواں کو احساس ہوا کہ سیمل کے ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں ہیں۔

"سوری۔" اس نے سیمل کے ہاتھ چھوڑ دیے اور سیمل کے بہتے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے پونچھنے کی شدید خواہش کو دباتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"اب آنسو پونچھ لیں پلیز — ورنہ اماں جان آ گئیں تو سمجھیں گی میں نے آپ کو رلایا ہے۔ بہت خفا ہوں گی وہ مجھ سے۔" سیمل نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھ کر پھر دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"چلیں اب اگر میجر نوشیرواں عادل کو موت آ بھی گئی تو اتنی خوشی ضرور ہو رہی ہے کہ میراں اماں کے علاوہ بھی کوئی نوشیرواں کی موت پر رونے والا ہے۔" سیمل نے ایک شاکی نظر اس پر ڈالی لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ لمحہ بھر دلچسپ نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔

"ایک بات کہوں سِم؟"

"جی نہیں، جب آپ کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے تو خاموش ہی رہیں اور یہ آپ مجھے سِم کیوں بلاتے ہیں — سیمل کہا کریں۔" بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"بات تو اچھی ہی تھی۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "لیکن خیر پھر کبھی سہی شاید ابھی اس کا وقت نہیں...... اور رہی یہ بات کہ میں آپ کو سِم کہہ کر کیوں بلاتا ہوں تو مجھے اچھا لگتا ہے اس طرح نام مختصر کر کے بلانا — بڑا اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ویسے سیمل کہنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت پیارا نام ہے۔" میراں اماں ابھی تک کچن میں ہی تھیں۔ اس نے سوچا اب وہ چلی جائے کہ میراں اماں نے کچن سے آواز دی۔

"شیری بچے، میں سیمل کے لیے میٹھی لسی بنا رہی ہوں تم پیو گے۔"

"جی اماں جان۔" نوشیرواں نے جواب دے کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں جتنے دن وزیرستان رہا یہاں اماں جان کے پاس حیدر کی بہن یا والدہ آ جایا کریں گی، آپ بھی

خیال رکھیے گا ان کا ۔ اور یہ میرا موبائل نمبر بھی لے لیں بھی کوئی مسئلہ ہو گیا تو مجھے فون کر دیجیے گا۔'' اس نے جیب سے بال پین نکال کر نوکل کے گتے پر اپنا نمبر لکھ دیا۔

''تو اماں جان ہمارے پاس رہ جائیں، اماں بھی خوش ہو جائیں گی، کتنے تنہا ہوتے ہیں ہم، حیدر کے گھر سے کسی کو آنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے میں اماں جان سے پوچھوں گا وہ کیا کہتی ہیں، ان کی مرضی ہوئی تو ٹھیک ہے اور ہاں میں آپ سے اس وقت پوچھنے لگا تھا آپ کس سے ڈر کر بھاگی تھیں اس روز۔'' سیمل نے ایک گہری سانس لے کر نوشیرواں کی طرف دیکھا۔

''ابا سے ..... وہ میرے ابا تھے اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور وہ ...'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ میراں اماں کچن کے دروازے پر لسی کے گلاس لیے کھڑی اسے اشارہ کر رہی تھیں کہ وہ گلاس لے جائے۔

سیمل کچن کی طرف جا رہی تھی اور نوشیرواں حیرت زدہ سا بیٹھا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

حبیب خان نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور پھر نیچے اتر کر پچھلا ڈور کھولا۔

''نیچے اترو۔'' لیکن وہ وہیں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اسے نیچے نہیں اترنا تھا، اسے گھر واپس جانا تھا اماں اور روحی کے پاس۔

''پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں آپ کو اللہ کا واسطہ۔'' اس نے التجا کی۔ ''اماں اور روحی بھائی پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''ہوتے رہیں۔'' انہوں نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور اسے پھر نیچے اترنے کے لیے کہا لیکن وہ یونہی ضد سی بیٹھی رہی۔ تب انہوں نے اسے بازو پکڑ کر کھینچا اور پھر یونہی کھینچتے ہوئے اندر آئے۔ لاؤنج کے وسط میں نازو کھڑی تھی۔ سیاہ اور سرخ بارڈر والی شال اوڑھے وہ عجب تمسخر بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ لاؤنج میں آ کر اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے وہ نازو سے مخاطب ہوئے تھے۔

''لے آیا ہوں اسے، اب دھیان رکھنا اس کا اور خبردار یہ نیچے اترنے نہ پائے۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔''

''ابا جی پلیز میں نہیں رہ سکتی اماں کے بغیر۔'' وہ پھر رونے لگی۔

''رہ لوگی خود ہی۔'' ان کا لہجہ بے حد سفاک تھا۔ ''سمجھنا تمہاری ماں مر گئی ہے اور بھائی بھی۔''

''نہیں..... خدا کے لیے ایسا مت کہیں۔'' وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

''نازو جاؤ اسے اوپر چھوڑ کر آؤ۔ سر میں درد ہونے لگا ہے۔'' نازو نے اس کے قریب آ کر اس کا بازو پکڑا تو اس نے اپنا بازو چھڑا لیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر اوندھی گر کر رونے لگی۔ کمرا وہی تھا اس کا اپنا لیکن خالی خالی اجنبی اور ویران لگ رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی پھر دروازہ کھلا تو وہ چونک کر سیدھی ہوگئی۔ کوئی ملازمہ تھی جو اس کا کالج بیگ لے کر آئی تھی۔ ملازمہ کے ہاتھ سے کالج بیگ لے کر اس نے آنسو پونچھے اور ملازمہ کے جانے کے بعد جلدی جلدی اسے کھولا اور کچھ کتابیں نکال کر باہر رکھیں پھر موبائل نکالا۔ کالج میں موبائل فون لے جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن روحی نے کہا تھا وہ اسے سائلنٹ پر رکھے، بھی کوئی مسئلہ ہو جائے تو فون کر لیا کرے ورنہ اسے یوز نہ کرے۔ اس نے موبائل فون بیگ میں سب کتابوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ لڑکیاں ادھر ادھر بیگ میں پابندی کے باوجود فون کا استعمال کرتی تھیں لیکن اسے بہت زیادہ شوق نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ فون گھر ہی رکھ جائے۔ اتنا ضروری تو اس کا گھر تھا۔ اس نے اٹھ کر بیڈ روم کا دروازہ بند کیا اور روحی کو فون کیا۔

''ہاں گڑیا، بیٹا کہاں ہو؟ ابھی خالہ جی کا فون آیا تھا کہ تم ابھی تک کالج سے نہیں آئی ہو۔ میں اب نکلنے ہی لگا تھا کہ تمہارے کالج سے پتا کروں۔''

''بھائی ..... وہ ....'' اور آنسوؤں نے اس کا حلق بند کر لیا۔

''کیا ہوا گڑیا ... بیٹا بولو کیا ہوا ہے؟'' روحی بے حد گھبرا گیا۔

''روحی بھائی، بابا مجھے کالج کے باہر سے زبردستی گھر لے آئے ہیں۔'' بہ مشکل بات ختم کر کے وہ پھر رونے لگی۔

''اوکے ... اوکے تم حوصلہ رکھو اور رونا نہیں بالکل۔ میں آ رہا ہوں۔'' فون بند کر کے اس نے پھر بیگ میں رکھ کر اوپر کتابیں رکھ دی تھیں اور آنسو پونچھ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''نیچے آ کر کھانا کھا لو۔'' ملازمہ پھر آئی تھی۔

وہ خاموش رہی۔ اسے ابھی نیچے نہیں جانا تھا۔ اس کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ اسے روحی کا انتظار تھا۔ مجیس سے یہاں تک آتے بھلا کتنا وقت لگے گا۔ ... وہ دل ہی دل میں حساب لگاتی رہی اور جب وہ اپنا کالج بیگ کاندھے پر لٹکائے کمرے سے باہر نکل کر سیڑھی تک آئی تو باہر گیٹ پر بیل ہو رہی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس نے روحی کو لاؤنج میں آتے دیکھا۔

''روحی بھائی۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ ابھی وہ آخری سیڑھی پر تھی کہ ڈائننگ روم سے حبیب خان نکل کر لاؤنج میں آئے ان کے پیچھے نازو تھی۔

''تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔'' ابا کی آواز سے تو وہ وہاں آخری سیڑھی پر ہی رک گئی۔ روحی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس سے کہا۔

''آؤ گڑیا۔'' اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

''وہیں رک جاؤ، خبردار ایک قدم آگے بڑھایا تو ... گڑیا تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔''

''گڑیا میرے ساتھ ہی جائے گی جس لیے

مجھے محبت کی تلاش ہے

میں تنہا ہوں
میں ادھورا ہوں
پل پل مرتا ہوں
پل پل جیتا ہوں
بس اک تنہائی میرے ساتھ ہے
اور مجھے محبت کی تلاش ہے
میں جہاں بھی گیا
میں جدھر بھی گیا
نفرتوں کے کانٹوں میں گھر گیا
تشنہ لب ہوں میں صحرا میں
پھر بھی اک آس ہے
اور مجھے محبت کی تلاش ہے
اجنبی منزلیں ہیں
اجنبی مسافتیں ہیں
ہجوم بے کراں ہے
اور میں تنہا ہوں
لیکن وہ نفرت بن کر میرے ساتھ ہے
اور مجھے محبت کی تلاش ہے

افشاں شادیان، گولارچی

لینے آیا ہوں۔ آؤ گڑیا۔" اس نے گڑیا کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن ابا نے اس کا راستہ روک کر اسے دھکا دیا۔

"رومی شرافت سے چلے جاؤ ورنہ میں گارڈ کو بلا لیتا ہوں۔" کچھ عرصے پہلے ابا نے گھر کی حفاظت کے لیے گارڈ رکھے تھے۔

"میں گڑیا کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ ابا پلیز گڑیا یہاں خوش نہیں رہے گی۔" رومی نے مصلحتاً اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی تھی۔ "اماں گڑیا کے بغیر نہیں رہ سکتیں وہ مر جائیں گی۔"

"تو مر جائے میری بلا سے۔"

"ابا جی ......"

"جاؤ یہاں سے۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "نکل جاؤ ورنہ مجھے گارڈ بلانے پڑیں گے اور آئندہ یہاں کبھی مت آنا۔"

"گڑیا......" رومی نے ابا کو نظر انداز کر کے سائڈ میں ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا جسے ابا نے بے دردی سے چھڑا لیا۔

"ابا جی میں گڑیا کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"تو ٹھیک ہے، میں تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا، ابھی اور اسی وقت۔"

"نہیں۔" گڑیا کے لبوں سے سسکی نکل گئی تھی۔ بے شک وہ الگ رہ رہے تھے لیکن امید تو تھی ایک آسرا تو تھا۔ شاید اماں یہ شاک برداشت نہ کر سکیں۔ وہ ابھی تک پورے طور پر ٹھیک نہیں ہوئی تھیں۔ رومی کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑا گڑیا کو دیکھتا رہا پھر سر جھکا کر واپس مڑا۔ جانے سے پہلے اس نے گڑیا کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی لیکن گڑیا کی آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں اور جوں ہی رومی لاؤنج سے سر جھکا کر نکلا وہ تڑپ کر اس کی طرف لپکی۔

"پیچھے ہٹو۔" ابا کا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ وہ رخسار پر ہاتھ رکھے ششدر سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ اسے ابا سے ڈر لگتا تھا۔ ابا اماں کو مارتے تھے ان سے جھگڑا کرتے تھے لیکن انہوں نے بچوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ گڑیا جب سے بڑی ہوئی تھی تو ایک دو بار اماں کو بچاتے ہوئے اسے ایک آدھ ہاتھ لگ گیا تھا لیکن اس طرح ابا نے کبھی اسے نہیں مارا تھا۔ ابا اب نازو کی طرف متوجہ تھے۔

"چوکیدار کو کہلوا دو اور گارڈز سے بھی کہہ دو کہ آئندہ اگر یہ یہاں آئے تو اسے دھکے دے کر نکال دیں، اندر مت آنے دیں اور اسے ......" انہوں نے مڑ کر گڑیا کو دیکھا۔ "باہر مت نکلنے دو...... اور چوکیدار کو بھی بتا دو، ہماری اجازت کے بغیر کسی کو باہر جانے دے نہ اندر آنے دے۔" نازو نے ایک فخریہ اور تمسخر بھری نظر اس پر ڈالی تھی اور اٹھلاتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

"سن لیا تو نے، جا اب اوپر اپنے کمرے میں جا۔ شاباش ......" گڑیا یکدم بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے سنا نازو کہہ رہی تھی۔

"میں کہتی ہوں ملک صاحب طلاق دے دیجیے اسے آپ ٹنٹا ہی ختم۔"

"بک بک مت کر۔" ابا کی آواز آئی تھی۔ وہ ابھی تک غصے میں تھے۔ وہ ایک بار پھر رو رہی تھی دھاڑیں مار مار کر لیکن اس کے رونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیا اب اسے ہمیشہ یہاں رہنا ہوگا اماں اور رومی سے دور۔

"نہیں ...... میں یہاں نہیں رہوں گی ہاں۔"

اس نے کمرے میں آ کر کالج بیگ اٹھایا تو فون وائبریٹ کر رہا تھا۔ اس نے بے تابی سے فون باہر نکالا، دوسری طرف رومی تھا۔

"چند دن کی بات ہے گڑیا، میں آج ہی اماں کے ساتھ فیملی کورٹ میں جا رہا ہوں اب میں قانونی طور پر تمہیں لے کر آؤں گا۔ ابا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تم بس حوصلہ رکھنا ...... گھبرانا نہیں بیٹا، یہ اماں سے بات کر لو۔" رومی نے فون اماں کو دیا۔

"اماں ......" اس سے کوئی بات نہیں کی گئی دوسری طرف اماں بھی خاموش تھیں لیکن ان کی سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔

"اماں میں ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں ......" بمشکل اس نے خود کو سنبھال کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی تب رومی نے اسے بہت ساری تسلیاں دینے کی کوشش کی تھی۔

"بہت جلد تم ہمارے پاس ہو گی گڑیا۔" اور پھر کتنے سارے دن رومی اس کے لیے کوشش کرتا رہا اور یہ سارے دن اس نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ ایک، ایک لمحہ اذیت سے بھرا تھا۔ نازو کا رویہ اس کے ساتھ انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ کھانے اور ناشتے کی میز پر ابا کے برابر بیٹھی نازو اسے زہر لگتی تھی۔ اسے دکھانے کے لیے وہ بڑی لگاوٹ سے ابا سے باتیں کرتی ملازمہ کی بجائے خود کھانا ڈالتی۔ ابا کی عدم موجودگی میں گڑیا پر حکم چلاتی۔ اس کے آنے کے دو دن بعد وہ اپنے دو تین جوڑے اس کے پاس لے کر آئی۔

"لو گڑیا بی بی، یہ میرے کپڑے ہیں، میں تو انہیں پہنتی نہیں، تم پہن لینا۔ ویسے بھی خالی ہاتھ آئی ہو، ایک جوڑا کپڑوں کا بھی ساتھ نہیں لائی ہو۔ تین دن سے ایک ہی جوڑا پہنے پھر رہی ہو۔" وہ خود کہاں آئی تھی اسے تو اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اور اس کے لائے ہوئے کپڑے اٹھا کر باہر پھینک دیے اور خود دروازہ بند کر کے بے تحاشا رونے کے بعد اس نے رومی کو بیل دی تو فوراً رومی کا فون آ گیا اور پھر گھنٹے بعد ہی چوکیدار نے اس کے کپڑوں کا بیگ اندر بھجوا دیا تھا۔ ابا اور نازو لاؤنج میں بیٹھے تھے جب ملازمہ بیگ لائی تھی۔

"جی یہ چوکیدار نے بھیجا ہے، کوئی رومی صاحب دے گئے ہیں گڑیا بی بی کے کپڑے اور کتابیں ہیں۔"

"جاؤ اوپر گڑیا کو دے آؤ۔" ابا ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ملازمہ بیگ اٹھا کر جانے لگی تو نازو نے روکا۔

"اے رکو دیکھنے تو دو، کیا ہے اس میں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس میں ایٹم بم ہوگا؟" ابا کا موڈ خراب تھا نہ جانے کیوں۔ اوپر والی سیڑھی کے پاس کھڑے کھڑے گڑیا نے سنا۔

"کہا تھا تم سے کہ اس کے لیے دو تین جوڑے کپڑے لے آؤ۔ تین دن سے ایک ہی جوڑا پہنے ہوئے ہے۔"

"دیے تو تھے اپنے جوڑے، تمہاری صاحبزادی کو پسند ہی نہیں آئے۔" وہ بے تکلفی سے ان کے کندھے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ گڑیا واپس مڑ گئی۔ ملازمہ بیگ اوپر لے آئی تھی۔ رومی بھائی نے اس کا چارجر اور کچھ کتابیں بھی بھجوا دی تھیں۔

یہ دن بہت مشکل تھے لیکن گزر گئے تھے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے یہاں بلانے کی خواہش ابا سے زیادہ نازو کی تھی۔ وہ اس پر حکم چلا کر جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کرتی تھی۔ اس کی پڑھائی ختم ہو گئی تھی۔ وہ اماں اور رومی بھائی سے دور تھی۔ وہ بہت کم کھاتی تھی، بہت کم سوتی تھی اس کی صحت کافی خراب ہو گئی تھی۔ جس روز فیصلہ اماں کے حق میں ہوا اس روز اسے تیز بخار تھا۔ رومی بھائی لیڈی پولیس کے ساتھ اسے لینے آئے تھے۔

"جاؤ دفع ہو جاؤ۔" نازو نے اس کے کمرے میں آ کر کہا۔ "باہر تیرا بھائی آیا ہوا ہے۔" وہ تیر کی طرح اٹھی تھی۔

جس روز عدالت میں اس کا بیان ہوا تھا اس نے روحی کو دیکھا تھا۔ وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ اماں کو دیکھنے کے لیے اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اماں کہیں نہیں تھیں اور اب کیا کہے گی وہ یہاں سے جا رہی تھی۔ رات ہی روحی نے اسے تسلی دی تھی۔

"انشاء اللہ صبح فیصلہ اماں کے حق میں ہو جائے گا۔ تم تیار رہنا۔" اس کا سامان تو پہلے ہی بیگ میں تھا۔ اسے کون سا تیاری میں وقت لگنا تھا۔ وہ بیگ گھسیٹتے ہوئے نیچے آئی۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ابا شاید اندر اپنے کمرے میں تھے۔ شاید ان سے اپنی شکست برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ لاؤنج سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا شاید اب وہ کبھی ابا کو نہیں دیکھ سکے گی تو کیوں نہ ابا سے مل لے۔ اس نے لاؤنج سے نکل کر گیسٹ روم کی طرف قدم بڑھایا تھا لیکن نازو نے جو اس کے پیچھے ہی آ رہی تھی اسے ٹوکا۔

"اے کدھر جا رہی ہو۔"

"ابا سے ملنے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں اگر اپنے ابا کی چاہ ہوتی تو اماں کے پاس رہنے کے لیے بیان نہ دیتیں۔ دفع ہو جاؤ اور آئندہ اپنی شکل مت دکھانا۔" اس نے حیرت سے نازو کو دیکھا تھا۔ یہ نازو تھی جو بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتی تھی۔ چھوٹی بی بی... گڑیا بی بی کرتے اس کے ہونٹ سوکھتے تھے۔ مگر اب... بیزاری سے اسے دیکھتے ہوئے وہ باہر چلی گئی۔ گیٹ کے باہر روحی بھائی کھڑے تھے اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے۔

"روحی بھائی..." وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ آنسو جھرنوں کی طرح اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑے تھے۔ روحی کی آنکھیں بھی نم تھیں لیکن وہ ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپتھپا رہا پھر اپنے ساتھ آنے والی لیڈی پولیس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ گاڑی میں

بیٹھے تھے۔ جب وہ گھر پہنچے تو اس نے اماں کو دیکھا وہ لاؤنج میں مضطرب سی بیٹھی اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھیں۔

"اماں جی میں گڑیا کو لے آیا ہوں۔" اماں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اماں کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

"اماں جی... اماں جی۔" اس کے آنسو ایک بار پھر آنکھوں سے جھرنوں کی صورت بہہ نکلے تھے۔ اماں کچھ دیر تو ساکت رہیں پھر ہولے ہولے ان کے ہاتھ اس کے گرد حائل ہو گئے پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اب وہ رو رہی تھیں زار و قطار اسے لپٹائے اسے چومتے ہوئے۔ کچھ دیر بعد روحی نے انہیں الگ کیا تھا۔

"بس اماں جی اب گڑیا کو کوئی ہم سے دور نہیں کر سکتا۔ ہاں ایک بندہ..." وہ مسکرایا۔

"کون...؟" بے حد حیرت سے سیل نے روحی کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے رخسار ابھی تک بھیگے ہوئے تھے اور پلکیں نم تھیں۔

"تمہارا دولہا۔"

"روحی بھائی آپ..." ماحول کی اداسی لمحے بھر کو ختم ہوئی تھی۔ اماں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ اماں اس گھر میں آنے کے بعد پہلی بار اس طرح روئی تھیں۔ وہ اس کی کمی کو محسوس کر رہی تھیں۔

"اماں انشاء اللہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائیں گی۔" روحی نے رات میں اسے بتایا تھا۔ "ڈاکٹر بہت پُرامید ہیں۔"

"آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں روحی بھائی اور اماں بھی۔"

"اور تم بھی تو بہت ویک ہو گئی ہو گڑیا۔ مجھے تمہاری بہت فکر تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں تم ہمت نہ ہار بیٹھو۔"

"شاید میں بہت بار تھکتی اگر جو ہر رات آپ سے بات نہ ہوتی۔ روحی بھائی، ابا، نازو کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ وہ ان سے لڑتے بھی نہیں تھے۔ ہو سکتا۔ اماں کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اماں کے ساتھ اس کا مقابلہ مت کرو۔ وہ بہت ہوشیار ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ ابا اور اماں کے درمیان اختلاف ہیں تو پتا نہیں کب اور کیسے ابا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کہ ہمیں پتا نہیں چلا۔ ایسے تعلق زیادہ دیر پا نہیں ہوتے تم دیکھنا ایک روز ابا ہماری طرف ضرور لوٹیں گے۔"

"کیا ایسا ممکن ہے بھائی؟"

"ہمیشہ اچھی امید رکھنی چاہیے گڑیا۔" اس روز اماں کے سونے کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہو گیا تھا۔ روحی نے اس کی میڈیکل لیو لے لی تھی۔ "کل سے تم کالج جاؤ گی۔"

"بہت سے لیکچر مس ہو گئے ہوں گے۔" وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"میں خود تمہیں پڑھا دیا کروں گا یا کسی ٹیوشن سینٹر یا اکیڈمی میں چلی جایا کرو۔"

"نہیں، میں کور کر لوں گی، کچھ جو سمجھ نہ آیا تو آپ سے سمجھ لوں گی۔"

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ روحی کی وہی روٹین تھی۔ وہ اکثر شام یا رات کو اماں اور گڑیا کو باہر گھمانے ضرور لے جاتا تھا اور کبھی اکیلے گڑیا کے ساتھ پھر وہ دل میں بانو بازار کی چاٹ کھا کر اور صدف نے پی کر دو بازار کی خاک چھانتے پھرتے۔ حالانکہ اب چیزوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا پھر بھی وہ جا جو چاہتے کر بھی ضرور خریدتے تھے۔ اس کے پاس اب کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہو گیا تھا۔ سیکنڈ ایئر کے پیپرز

سونا سونا دل ہے میرا

سونا سونا دل ہے میرا

سونا ہے یہ جیون

نگاکر پیت پیا تم

ہم سے ایسے روٹھ گئے ہو

سونا سونا آنکھ کا منظر

سونا سونا جگ سارا

کیے دنوں کے گزرے لمحے

آنکھ سے سب روٹھ گئے ہیں

ہاتھ سے سارے چھوٹ گئے ہیں

تم بن دل ہے سونا سونا

آنکھوں کا سونا درپن ہے

کاش وہ لمحے پھر آ جائیں

تیرے دل میں پیار جگائیں

آنکھیں بھی پتھرا گئی ہیں

جانے والے لوٹ کے آ جا

جانے والے لوٹ کے آ جا

اس وادی کو اپنا کر لو

شاعرہ: غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ

دے کر وہ فارغ ہوئی ہی تھی کہ روحی نے بتایا وہ گھر بدل رہا ہے۔

"آج کل میں میری پوسٹنگ ہونے والی ہے کہیں بھی۔ زیادہ امکان ہے اسکردو یا سیاچن میں۔" روحی نے اسے بتایا "اور جانے سے پہلے میں کسی اچھی جگہ پر آپ لوگوں کو چھوڑنا چاہتا ہوں جہاں آپ

یہاں کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہوں اور ابا کو بھی اس جگہ کا علم نہ ہو۔ یہ گھر ابا کے علم میں ہے سو ہو سکتا ہے میری عدم موجودگی میں کسی روز وہ آ کر تنگ کریں اماں کو اور تمہیں۔" روحی نے گھر بدلنے کی وضاحت کی تھی۔

ابا اس ایک سال میں ایک بار بھی نہیں آئے تھے حالانکہ کورٹ نے آرڈر دیا تھا کہ مہینے میں ایک بار اسے والدہ سے ملنے دیا جائے لیکن ابا نے پھر خبر ہی نہیں لی تھی۔

"ہو سکتا ہے وہ یہاں نہ آئیں لیکن احتیاط ضروری ہے۔" اور پھر وہ حسن آباد آ گئے۔ یہ گھر اندر گلی میں تھا اور بہت سیف تھا۔ پرانے انداز کا گھر، صحن برآمدہ، دو کمرے ایک ڈرائنگ روم جس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور ایک اندر صحن میں۔ آس پاس سب لوگ اچھے تھے ہمدرد اور مخلص۔ آس پاس کے کئی گھروں سے ان کے تعلقات ہو گئے تھے۔ سب ہی محبت اور شفقت سے ملتے تھے۔ ان کے گھر کے بالکل سامنے والی گلی میں حمنہ کا گھر تھا۔ حمنہ سے اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ اس نے بھی ایف اے کا امتحان دے رکھا تھا اور اب رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک روحی کی پوسٹنگ کے آرڈرز نہیں آئے تھے۔ روحی نے ڈاکٹر عمر کے مشورے پر اماں کا ڈاکٹر تبدیل کر دیا تھا۔ ڈاکٹر عرفان کا کلینک حسن آباد میں ہی تھا اور روحی چاہتا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں گڑیا کے لیے اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا مشکل نہ ہو۔ ان دنوں وہ گڑیا کو ہر بات سمجھا رہا تھا۔ بینک کے معاملات اور دوسری باتیں۔ وہ پہلے روز جب روحی کے ساتھ بینک گئی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

"تم خالہ بی کے ساتھ یہاں آ کر چیک کیش کروا لینا۔" جس روز اس کا ایڈمیشن بی اے میں ہوا اس روز اس کے سیاچن پوسٹنگ کے آرڈرز آ گئے تھے۔ اماں کی حالت کے متعلق کچھ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر عرفان بھی ڈاکٹر عمر کی طرح پرامید تھے لیکن کبھی کبھی وہ اردگرد سے بالکل بے خبر ہو جاتی تھیں۔ جیسے پورے ماحول سے کٹ گئی ہیں اور کسی اور ماحول میں ہوں پھر ایک روز روحی کو جانا پڑا، وہ پوری رات چپکے چپکے روتی رہی تھی۔ صبح اس کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر روحی پریشان ہو گیا تھا۔

"گڑیا تمہیں خود کو بہادر بنانا ہے، تمہیں اماں کا بھی خیال رکھنا ہے اور اپنا بھی۔ میں جب واپس آؤں گا تو تمہاری شاندار کامیابی سیلیبریٹ کریں گے۔ زبردست قسم کا ڈنر ہوگا۔" وہ اس کا دل بہلا رہا تھا وہ جانتی تھی۔

"میری خواہش تھی کہ تم بی ایس سی کرتیں یا پھر کسی پروفیشنل لائن میں جاتیں لیکن تم نے بی اے میں ایڈمیشن لے لیا۔"

"ہاں، میں پہلے اردو میں اور پھر انگلش لٹریچر میں ایم اے کروں گی۔" کہانیوں کی رسیا گڑیا نے بتایا تو وہ مسکرا دیا۔ "اور پھر حمنہ بھی تو بی اے کر رہی ہے۔"

"اور یہ اصل وجہ ہے تمہارے بی اے میں ایڈمیشن لینے کی۔" اس نے قہقہہ لگایا وہ جھینپ گئی تھی۔ پھر وہ چلا گیا لیکن اس کا رابطہ گڑیا سے مسلسل رہا تھا۔ کبھی کبھار اس کا کوئی خط بھی آ جاتا تھا جو کبھی کراچی سے کبھی راولپنڈی سے کبھی کہیں اور سے پوسٹ کیا جاتا تھا۔ وہ اسکردو سے آنے والے کسی نہ کسی بندے کو دے دیتا تھا۔ کچھ ماہ بعد وہ سیاچن سے واپس آیا تھا اور اس کے پاس کرنے کے لیے بہت باتیں تھیں۔ وہ رات گئے تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ اسے صحن میں بیٹھنا بہت پسند تھا۔

"یہ گھر مجھے اس لیے اچھا لگتا ہے کہ یہاں سے

آسمان نظر آتا ہے۔ بالکل گاؤں والے گھر کی طرح۔ میں جب ریٹائر ہو جاؤں گا تو پھر ہم تینوں گاؤں جا کر حویلی میں رہیں گے۔ کھلی فضاؤں میں رات کو آسمان پہ چمکتے ستارے ہوں گے۔" اس نے گڑیا کو سیاچن کے متعلق بتایا تھا۔ گڑیا بہت حیرت اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی تھی۔

"یہ ہے گڑیا سیاچن دنیا کا بلند ترین جنگی مقام ہے۔ وہاں ہر رات آرمی میس میں اکثر یہ باتیں ہوتی ہیں کہ ہم اگر کارگل کی کچھ چوکیوں پر قبضہ کر لیں تو ہم کشمیر کی طرف عالمی دنیا کی توجہ مبذول کروا سکتے ہیں۔ وہاں میس میں بہت جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ لوگ شہادت پانے کی تمنا کرتے ہیں۔ میرے دل میں بھی یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ اللہ مجھے بھی شہادت کا اعزاز دے لیکن پھر مجھے تمہارا اور اماں کا خیال آ جاتا ہے تم لوگ میرے بعد بالکل اکیلے ہو جاؤ گے۔ تب تمہاری محبت کا جذبہ غالب آ جاتا ہے اور یہ جذبہ شہادت ہر جذبے سے بڑھ جاتا ہے۔" ان دنوں وہ خاصا سنجیدہ سا لگتا تھا اور اماں کے متعلق بہت متفکر۔

"میں سوچ رہا ہوں کسی اور ڈاکٹر سے بھی اماں کے لیے رائے لے لوں۔ اماں کی امپروومنٹ کی رفتار بہت سست ہے۔" یہ اکتوبر کا مہینہ تھا اور ہلکی خنکی شروع ہو گئی تھی۔ وہ رات کو کافی پیتے چلے جاتے تھے۔

روحی نے اماں کو دو تین اور ڈاکٹرز کو بھی دکھایا۔ ایک دو ہفتے کے بعد وہ پھر واپس اسکردو چلا گیا تھا پھر اچانک وہ جنوری 1999ء میں واپس آ گیا تھا صرف دو ہفتے کے لیے۔ اس دوران وہ خاصا مصروف رہا تھا۔ اس نے گڑیا کے اکاؤنٹ میں اپنی ساری رقم منتقل کروا دی تھی۔

"تمہیں مالی پریشانی کبھی نہیں ہو گی گڑیا۔ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو گیا تو....." جانے سے پہلے اس نے کہا تھا۔ گڑیا رونے لگی تھی۔

"میں ایک اچھا گھر خریدنا چاہتا ہوں۔ کرائے کے گھر کا کیا اعتبار جب جی چاہے مالک خالی کروا دے۔" پھر اس نے اقبال ٹاؤن میں ایک گھر خرید لیا جو گڑیا کے نام تھا۔

"وہاں جو کرائے دار رہ رہے ہیں، میں نے انہیں گھر خالی کرنے کو نہیں کہا۔ وہ بدستور رہتے رہیں گے اور کرایہ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ وکیل صاحب کو میں نے تمہارے اور اماں کے معاملات کا نگراں بنا دیا ہے۔ یہ جگہ سیف ہے، لوگ اچھے ہیں اس لیے تمہیں یہاں ہی رہنا ہے جب تک کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو وکیل صاحب کو بتا دینا۔ دو ماہ کے نوٹس پر وہ گھر خالی کرا دیں گے۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"آپ ایسی باتیں مت کریں۔"

"یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں گڑیا اور تمہیں خود کو ان حقائق کا سامنا کرنے کے قابل بنانا ہے۔ میں جانتا ہوں ابھی تم بہت چھوٹی ہو — ابھی تم کہانیوں کی دنیا میں رہتی ہو۔ تمہیں نیلی کا دکھ رلاتا ہے، تم روز لی کے لیے آنسو بہاتی ہو، تمہیں ایک مکان دو دیواریں کے امجد کا دکھ راتوں کو جگا دیتا ہے لیکن جیتا زندگی کی کہانی میں ایسے کئی دکھ کبھی کبھی ہمیں بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔"

لیکن اسے خود کو کسی اور دکھ کے لیے تیار نہیں کرنا تھا۔ کیا یہ کم تھا کہ اس کے ابا اور اماں کے درمیان علیحدگی ہو گئی تھی اور ابا نے ایک کمتر عورت کو اماں پر ترجیح دی تھی اور اماں ابھی تک صدمے کی کیفیت میں تھیں۔

"وہ بہت کم حوصلہ ہیں، بہت کمزور دل ہیں۔ میرے اللہ مزید اور کوئی دکھ نہیں۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں لیکن آنسو تھے کہ امڈے چلے آتے تھے۔ روحی

نے خود اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"آپ آری چھوڑ دیں۔" اس نے ضد کی۔

"سوچوں گا گڑیا۔" اس نے اسے ٹالا تھا۔

"ابھی تو مجھے جانا ہے۔" اس روز اماں بھی رات گئے تک ان کے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ ہیٹر جلا کر اس نے اماں کے قریب رکھ دیا تھا اور خود اپنے ہاتھوں سے مونگ پھلی اور چلغوزے چھیل چھیل کر کبھی اماں اور کبھی گڑیا کو دیتا رہا۔

اماں کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ بار بار روحی کی طرف دیکھتی تھیں۔ ایک بار جب روحی نے چلغوزے چھیل کر ان کی طرف بڑھائے تو انہوں نے روحی کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور بہت دیر تک وہ روحی کا ہاتھ یونہی تھامے رہیں۔ شاید یہ ماں کا دل تھا ورنہ دوا کے زیر اثر وہ اس وقت سو چکی ہوتی تھیں۔ صبح روحی کی واپسی تھی پھر ہوتے ہوتے اماں کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو اس نے اماں کا ہاتھ تھام کر اٹھایا اور بیڈ پر لیٹنے کے لیے کہا۔ اماں لیٹ تو گئی تھیں لیکن گڑیا نے دیکھا تھا وہ بار بار بند ہوتی آنکھیں کھول کر روحی کو دیکھتی تھیں۔ کوئی اندرونی احساس تھا جو انہیں سونے نہیں دے رہا تھا لیکن پھر وہ سو گئیں۔ اماں کو اچھی طرح کمبل اوڑھا کر نائٹ بلب جلا کر وہ باہر نکلا — خالہ جی اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔

"خالہ جی آپ ذرا اماں کے کمرے میں لیٹ جائیں، ہم ابھی آتے ہیں اور دروازہ ہم باہر سے بند کر جائیں گے۔ آپ آرام سے سو جانا۔" اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ گڑیا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"اس وقت کہاں جانا ہے؟"

"باہر روڈ پر چہل قدمی کریں گے، تم کوٹ پہن لو اور شال لے لو۔" لاہور میں بھی جنوری کی اس رات کو کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ وہ دونوں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹن آباد کی اندرونی گلیوں سے نکل کر باہر روڈ پر آگئے تھے۔ گلیوں میں ویرانی تھی۔ اکا دکا لڑکے اپنی اپنی بائیک پر بیٹھے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ لیکن روڈ پر گاڑیاں آجا رہی تھیں۔

"ڈاکٹر عرفان کے کلینک کی طرف ایک کافی ہاؤس ہے جو تقریباً ایک بجے تک کھلا رہتا ہے وہاں چل کر کافی پیتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں دل چاہ رہا تھا کہ باہر کھلی فضا میں گھوموں اور ان خنک ہواؤں کو اپنے اندر اتار لوں۔" گڑیا بے حد اداس تھی صبح وہ جا رہا تھا اور پھر پتا نہیں کب آئے گا۔

"اندازاً چھ ماہ تک چکر لگاؤں گا۔" روحی نے اسے بتایا۔ "ہو سکتا ہے میری پوسٹنگ اسکردو کے بعد راولپنڈی میں ہو پھر میں تمہیں اور اماں کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اور آپ کی شادی بھی کرنی ہے بھیا۔"

"ہیں، یہ اچانک میری شادی کا خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"وہ حسنہ کہہ رہی تھی کہ اب ہمیں — بھیا آپ کی شادی کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔ اماں کی طبیعت تو ٹھیک نہیں اور یہ کام مجھے ہی کرنا ہے۔ آپ جب اسکردو سے آجائیں گے تو میں اور حسنہ مل کر آپ کے لیے لڑکی تلاش کریں گے۔ پتا ہے میں نے کالج کی ساری خوب صورت لڑکیوں کی فہرست بنالی اور وہ حسنہ بدتمیز کہہ رہی تھی کہ میں اس کا نام فہرست میں شامل کرلوں کیونکہ اس کے خیال میں بھی خاصی خوب صورت ہے۔"

"ہاں تو کرلو… پھر ایک سوئمبر رچانا۔" روحی کا موڈ ایک دم ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ "لیکن ایک بات ہے۔ اپنی شادی سے پہلے مجھے تمہارے لیے ایک دولہا تلاش کرنا ہوگا۔"

"جی نہیں، آپ مجھ سے پورے گیارہ سال بڑے ہیں۔" وہ یونہی باتیں کرتے کرتے کافی شاپ تک آگئے تھے۔ کافی شاپ پر رش نہیں تھا صرف چند لوگ کھڑے تھے اور اندر بینچوں پر ایک فیملی بیٹھی تھی بچوں سمیت — شاید وہ بھی ان کی طرح کے کوئی سرپھرے تھے۔ وہ کافی پی کر واپس لوٹے تو ان کے چہرے خنک ہوا سے ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے روحی نے آہستگی سے کہا تھا۔

"گڑیا! آج میں نے ابا کو فون کیا تھا۔"

"پھر؟" گڑیا کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"میرا بھی چاہ رہا تھا ان سے بات کرنے کو لیکن انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں سیاچن میں ہوں اور وہاں دشمن کی جو سرگوشیاں ہو رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عنقریب کوئی نیا محاذ کھلنے والا ہے۔ گڑیا میں ان سے معافی مانگنا چاہتا تھا اپنی گستاخی کی اگرچہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا لیکن پھر بھی وہ باپ ہیں اور میں نے سوچا ان سے معافی مانگ لوں اور ان کی آواز سن لوں۔" گڑیا دم بخود سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بے حد شاندار نظر آنے والے ابا آگئے تھے۔

"پھر؟" گڑیا نے پوچھا، روحی نے ایک گہری سانس لی۔

"انہوں نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا وہ کسی روحی کو نہیں جانتے اور فون بند کر دیا۔" گڑیا بھی افسردہ ہو گئی تھی۔

دروازہ کھول کر وہ گھر میں آئے تھے۔ اماں اور خالہ جی سو رہی تھیں لیکن گڑیا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ خالہ نے کارپٹ پر بستر بچھائے سو رہی تھیں۔ گڑیا بیڈ پر لیٹ گئی — کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر روحی کے کمرے میں جائے اور دیکھے کہ اگر وہ سو نہیں رہا تو اس سے باتیں کرے لیکن پھر یہ سوچ کر چپکی لیٹی رہی کہ صبح اس نے واپس جانا ہے۔ خواہ مخواہ ڈسٹرب نہ کروں پھر پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی اور جب خالہ جی نے صبح اسے جگایا تو روحی جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ باہر ڈرائیور جیپ کے ساتھ موجود تھا۔

"خالہ جی آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں جگایا۔" وہ ناراض ہوئی۔

"میں نے منع کیا تھا، رات دیر سے سوئی تھیں نا تم۔" روحی نے کہا تو وہ چپ کر گئی۔ اماں سے مل کر وہ اس کی طرف آیا تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ جب بھی کہیں جاتا تھا چاہے ایک دن کے لیے کیوں نہ جانا ہوتا تو وہ رو پڑتی تھی جب وہ کاکول میں تھا جب ہی لیکن اب وہ ہونٹ بھینچے کھڑی تھی۔

"گڑیا…" اس کے پاس رک کر اس نے آہستگی سے کہا۔ "ایک بات جو میں جب سے یہاں آیا ہوں تمہیں بتانا چاہتا ہوں اور بتانے کی ہمت نہیں پا رہا…… وہ یہ ہے کہ ایک آپریشن کی تیاری ہو رہی ہے۔ گڑیا جب میں جاؤں گا تو ہو سکتا ہے میں بھی اس آپریشن کے لیے جانے والوں میں شامل ہوں—— جنگ میں کچھ پتا نہیں ہوتا گڑیا کہ کون غازی بنے گا اور کس کی قسمت میں شہادت لکھی جائے گی۔ ایسا کچھ ہوا گڑیا تو تم نے حوصلے سے کام لینا ہے۔ اماں کا خیال رکھنا ہے اور اگر کبھی ابا تمہیں اور اماں کو لینے آئیں تو تم چلی جانا ان کے ساتھ—— عورت کو ہمیشہ مرد کے سائبان کی ضرورت ہوتی ہے گڑیا اور انہیں معاف کر دینا۔ وہ جیسے بھی ہیں ہمارے ابا ہیں اور اماں کے شوہر ہیں لیکن اگر وہ نہ لینے آئیں تو تم نے ہی اماں کا خیال رکھنا ہے۔" وہ بھلا اماں کا اکیلے خیال کیسے رکھ سکے گی۔ اس نے سوچا تھا لیکن تب وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے اکیلے ہی اماں کا خیال رکھنا ہے اور آج کے بعد وہ کبھی روحی کو نہیں دیکھ سکے گی اور کبھی اس کی باتیں نہیں سن سکے گی یہ آخری بار تھی جب وہ

اسے دیکھ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ چپ ہوا تو گڑیا کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگی تھی۔ رومی نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور پھر تیزی سے جا کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ پھر بہت دن بیت گئے۔ رومی کا کبھی کبھی فون آجاتا۔ اس نے بتایا تھا کہ انہوں نے برف پوش چوٹیوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ہے۔

کئی دن گزر گئے رومی کا فون نہیں آیا۔ وہ ہر لمحہ اس کی سلامتی اور بخیریت واپسی کی دعائیں مانگتی رہی۔ یہ مئی کی 26 تاریخ تھی جب رومی نے آخری بار اس سے بات کی تھی۔ وہ بہت پرجوش تھا۔ اس نے کیپٹن حسام کے متعلق بتایا تھا۔ وہ کیپٹن شیر کے متعلق بھی بات کرتا رہا تھا اور پھر اس کے بعد گڑیا کی اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ یہ سولہ جون تھی جب وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ اماں اس کے پاس ہی بیٹھی خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔

"اتنے دن ہو گئے ہیں اماں رومی بھائی کا فون نہیں آیا۔ آپ دعا کریں نا... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" سامنے ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں۔

"آج کارگل کے محاذ پر کیپٹن احسن اور کیپٹن مروان حبیب خان دشمن کی گولہ باری سے شہید ہو گئے تاہم وہ دشمن کو ایک پوسٹ پر جارحیت سے روکنے اور بھگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کیپٹن احسن آرٹلری اور کیپٹن مروان حبیب پنجاب رجمنٹ یونٹ نمبر۔" نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا اور وہ سکتے کے عالم میں ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

نوشیرواں کو گئے بہت دن ہو گئے تھے۔ اس دوران اس نے صرف دو تین بار ہی رابطہ کیا تھا۔ میراں اماں اس کے لیے پریشان تھیں گو وہ ظاہر نہیں کرتی تھیں لیکن حسیبل جانتی تھی کہ وہ اندر سے بہت پریشان ہیں۔ خود اس نے بھی کتنی بار دعا کی تھی۔

"یا اللہ میراں اماں کو مزید کوئی دکھ نہ دینا۔ ان کا سینہ تو پہلے ہی چھلنی ہے۔ اللہ جی نوشیرواں کو بچانا ہو۔" وہ اخبار پڑھتی تو دہل جاتی۔

میراں اماں کی نظریں اس پر ہوتیں۔

"ادھر کی کوئی خبر ہے؟"

"نہیں اماں جان کوئی خبر نہیں ہے سب ٹھیک ہے۔" وہ ان سے نظریں چرا لیتی۔ حالانکہ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ نوشیرواں کے جانے کے بعد وہ میراں اماں کو گھر میں لے آئی تھی۔ اماں خوش تھیں تو فضیلت بھی خوش تھی۔ اسے سب کام کرنے والیوں کی طرح باتوں کا چسکا تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے میراں اماں سے دنیا جہاں کی باتیں کرتی رہتی اور خود حسیبل کو لگتا جیسے سالوں بعد گھر میں زندگی لوٹ آئی ہو۔ میراں اماں کے آنے سے جیسے گھر میں ایک دم برکت اور رونق آگئی تھی۔ کبھی کبھی نوشیرواں کے پرانے ملازم حیدر کی بیوی آجاتی تو میراں اماں اسے لے کر گھر جاتیں اور گھر کی صفائی وغیرہ کروا کے واپس آجاتیں۔

"اچانک نوشیرواں آجائے تو گھر مٹی سے بھرا پڑا ہو، وہ ناراض ہوگا۔" وہ حیدر کی بیوی کو تاکید کرتی تھیں کہ تین چار روز بعد وہ ضرور چکر لگایا کرے۔

"اماں جان آپ کا لہجہ اتنا صاف ہے جیسے پنجابی لہجہ۔ حالانکہ قبائلی اس لہجے میں بات نہیں کرتے۔ آپ کے لہجے سے تو بالکل پتا نہیں لگتا کہ آپ کا تعلق قبائلی علاقے سے ہے۔" ایک روز اس نے پوچھا تھا۔

"اس لیے بچے کہ میری ماں پنجابی تھیں۔ میرے والد آرمی میں میجر تھے اور میری والدہ ان کے کسی دوست کی بیٹی تھیں۔ نیری کی دادی بھی پنجابی تھیں۔ میری والدہ نے ہی یہ شادی کروائی تھی۔ ان کی کزن تھیں وہ۔ ہمارے خاندان کے سب مرد آرمی میں رہے

شیری کے ۔۔۔ پاکستان بننے سے پہلے برٹش آرمی میں صوبیدار تھے۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں کو فوج میں ہی بھیجا۔ شیری کے ۔۔ آرمی میں کرنل تھے۔ میں ایک فوجی کی بیوی اور ایک فوجی کی بیٹی ہوں۔ میرے دونوں بیٹے بھی آرمی میں ہی تھے۔ اس لیے ہم اپنے علاقے میں بہت کم گئے۔ میرا بچپن لڑکپن اور پھر شادی کے بعد زندگی بھی زیادہ تر پنجاب سندھ وغیرہ میں گزری۔ پاکستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں پوسٹنگ رہی۔ گل کا چچا اور میرا چھوٹا بیٹا 71ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کے محاذ پر شہید ہو گیا تھا۔" وہ فخریہ انداز میں بتا رہی تھیں۔

"گل کے ابا نے آرمی سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ ان کے گردوں کا کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔ تب ہم اپنے علاقے میں کئی سالوں بعد گئے تھے۔ میری دونوں بچیاں وہاں تھیں۔ شیری تو زیادہ تر ہمارے پاس ہی رہا۔ تعلیم حاصل کی پھر کمیشن مل گیا۔" میراں اماں نے اسے تفصیل بتائی تھی لیکن وہ تو میراں اماں کے روشن چہرے کو دیکھتے ہوئے ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی کہ وہ میراں اماں سے پوچھے جب انہیں اپنے بیٹے کی شہادت کی خبر ملی تھی تو انہوں نے کیا سوچا تھا۔ کیا انہیں فخر محسوس ہوا تھا یا ان کا دل چھلنی ہو گیا تھا۔ وہ روئی تھیں یا انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ ایک شہید کی ماں ہیں۔ وہ تو مہینوں روتی رہی تھی تڑپ تڑپ کر بلک بلک کر ۔۔۔ خالہ بی اور حنا اسے بہ مشکل سنبھالتی تھیں۔ اماں بس ایک جگہ بیٹھی ٹکر ٹکر اسے دیکھتی تھیں اور پھر دیوانہ وار اٹھ کر پورے گھر میں چکراتیں۔ ہر کمرے میں ان کی آنکھیں کسی کو کھوجتی تھیں اور پھر مایوس سی ہو کر وہ تخت پر بیٹھ جاتیں اور سیمل کو روتے بلکتے دیکھتی تھیں خاموش اور چپ۔

وہ کوئی بلند حوصلہ لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو بہت کمزور عام اور معمولی لڑکی تھی اور اس کا دل بھی اتنا چھوٹا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مروان کی شہادت پر فخر محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے اس فخر کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے مروان کی ضرورت تھی۔ مروان جو اس کا بھائی تھا۔ اس سے پورے گیارہ برس بڑا لیکن جب اس نے سیمل کو دوست بنایا تھا تو اس نے کہا تھا۔

"گڑیا زوہی تمہارا بڑا بھائی ہے اور مروان تمہارا دوست۔" اور جب سے ان کے درمیان دوستی کا رشتہ بنا تھا وہ اسے جب بھی اپنی کوئی بات شیئر کرنا ہوتی مروان کہہ کر بلاتی ۔۔۔ ورنہ عام دنوں میں وہ اس کا روحی بھائی تھا۔ وہ بھائی بھی تھا اور دوست بھی تھا۔ جس سے پہلے واحد دوست تھا وہ اس کی شہادت پر فخر نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کے بچھڑ جانے پر بلکتی تھی۔ اللہ سے شکوہ کرتی تھی۔ کیا ضروری تھا کہ کارگل کی جنگ میں شہید ہونے والوں میں مروان بھی شامل ہوتا۔ اتنے سارے لوگوں نے جانیں دی تھیں ایک مروان نہ ہوتا تو کیا فرق پڑتا ۔۔۔ وہ ان کا واحد سہارا تھا اور پھر کسی بھی جنگ سے حاصل حصول تو کچھ ہوتا نہیں بس بہت سارے گھروں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ شاید وہ سب ان کی شہادت پر فخر کرتے ہوں لیکن وہ نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی نہیں ۔۔۔ وہ میراں اماں کے پاس سے اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی اور مروان سے باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ ہر رات سونے سے پہلے ڈائری میں مروان کو مخاطب کر کے روز کی روداد لکھتی تھی۔ کتنے سال ہو گئے تھے اسے ایسا کرتے ہوئے۔ کتنی ڈائریاں بھری پڑی تھیں جب وہ لکھتی تو اسے لگتا جیسے وہ سچ مچ مروان سے باتیں کر رہی ہو۔ اگر وہ یوں مروان سے ہر روز باتیں نہ کرتی تو شاید غم سے اس کا دل پھٹ جاتا۔ کتنے سال ہو گئے تھے مروان کو بچھڑے ۔۔۔ وہ سولہ جون 1999ء کا نو بجے والا خبرنامہ تھا جب اس نے وہ خبر

سنی تھی اور پھر 17 جون کو اس کا جسد خاکی لاہور لایا گیا تھا۔ اسے منہ نے بتایا تھا جب وہ پاگلوں کی طرح ہر اس نمبر پر فون کر رہی تھی جو مروان نے اسے دیے تھے تب منہ روتے ہوئے اس کے پاس آئی تھی اور اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"سیمل... سیمل، بھائی کہہ رہا ہے کہ مروان بھائی اور کیپٹن احسن کے تابوت اسکردو سے آگئے ہیں ابھی ابھی ٹی وی پر دکھایا ہے اور وہ انہیں ملک ہاؤس میں لے گئے ہیں۔ تمہارے ابا کے گھر۔" منہ اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ وہ مروان کو وہاں کیوں لے گئے تھے۔ کیا مروان نے وہاں کا ایڈریس لکھوایا ہوا تھا کہ ---- وہ بہت سمجھدار تھا۔ جانتا تھا ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے یا پھر مروان کی کوئی اور مصلحت تھی لیکن مروان کے تابوت کو ابا نے وصول کیا تھا۔ اس کا جنازہ وہاں سے اٹھا تھا اس گھر سے جسے وہ خود چھوڑ آیا تھا۔ وہ خالہ جی، منہ، اماں اور محلے کی بہت ساری دوسری عورتوں کے ساتھ ملک ہاؤس گئی تھی کتنے سالوں بعد ---- وہ وہاں ملک ہاؤس میں لونگ روم سے ملحقہ بڑے ہال میں مروان کے تابوت کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے شیشے میں سے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس نے اماں کو گر گر کر تابوت کو دیکھتے دیکھا تھا۔ اس نے ابا کو دو تین بار اندر آتے اور تابوت پر جھک کر مروان کا چہرہ دیکھتے دیکھا تھا۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔ وہ یونہی اماں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے منہ کے کندھے پر سر رکھے لکڑی کے تابوت کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے انہیں دیکھا تھا مروان کو لے جاتے پھر پورے فوجی اعزاز کے ساتھ اسے دفن کر دیا گیا۔ وہ جن عورتوں کے ساتھ وہاں گئی تھی انہی کے ساتھ واپس آگئی۔ وہاں کیا تھا جو رکتی۔

"تم ادھر رکو گی؟" منہ نے پوچھا لیکن وہ گم ہو گئی تھی۔ ابا پتا نہیں کہاں تھے۔ شاید باہر لان میں جہاں شامیانے لگا کر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کمن آباد سے پاس پڑوس کے سب ہی جنازے میں شامل ہوئے تھے۔ وہ اندرونی سمت نکل رہی تھی جب نزہت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ان گزرے سالوں میں خاصی موٹی ہو گئی تھی۔

"سنو اب تمہارا بھائی مر گیا ہے تو تمہیں اس پاگل عورت کو ساتھ لے کر ادھر نہ آنا۔ دھکے مار کر نکلوا دوں گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا باپ اپنا ہے [illegible] بھول گیا ہے کہ تم نے عدالت میں کہا تھا تم باپ کے ساتھ نہیں ماں کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔ یہ تو میں ہوں جس نے اسے روکا ہوا ہے ورنہ اب تک وہ تمہیں عاق کر چکا ہوتا۔" منہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"ہاتھ پیچھے کرو۔" اور پھر یہ منہ ہی تھی جو خالہ جی اور اماں کو گھر لے کر آئی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں آتا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ کتنے سارے دن آس پاس کی عورتیں ان کی دلجوئی کے لیے آتی رہیں کتنے دن آس پاس کے گھروں سے کھانا پک کر آتا رہا پھر خالہ جی نے منع کر دیا۔ مروان سچ کہتا تھا کہ یہ اچھے اور ہمدرد لوگ ہیں۔ منہ تو ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی لیکن وہ تو جیسے خود سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ دن میں کئی کئی بار وہ مروان کے نمبر پر فون کرتی جواب نہ ملنے پر اس کے فون کے انتظار میں [illegible] جاتی۔

اماں ایک بار پھر ڈپریشن میں چلی گئی تھیں خاموش سپاٹ نظروں سے اپنے سامنے دیکھتی رہتیں۔ اپنے ماحول سے بالکل بیگانہ وہ کسی اور ماحول اور [illegible] میں گم۔ منہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اماں کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تو تب خالہ جی تھیں جو اماں کا بھی اور اس کا بھی خیال رکھ رہی تھیں۔ اماں کو دوائی دینا ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا سارے کام خالہ جی کے تھے تب ایک روز اماں کی [illegible] خراب ہونے لگی۔ انہیں دورے کی تکلیف ہوتی تھی۔ منہ ہی ڈاکٹر عرفان کو لے کر آئی تھیں۔ ڈاکٹر عرفان نے اماں کا چیک اپ کر کے دوائی دی تھی اور اسے جھڑکا تھا۔

"آپ بالکل بھی اپنی اماں کا خیال نہیں رکھ رہی ہیں سیمل بی بی ---- جتنی امپروومنٹ ان کے کیس میں ہوئی تھی وہ سب ختم ہو گئی ہے وہ پھر زیرو پر آگئی ہیں۔ ایسا رہا تو آپ اپنی اماں کو بھی کھو دیں گی۔ اکثر ایسے مریضوں کا رجحان خودکشی کی طرف ہو جاتا ہے۔"

"نہیں۔" وہ ساری جان سے کانپ گئی تھی۔ وہ اماں کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ مروان کیا کہے گا اس نے اماں کا خیال نہیں رکھا۔ وہ ناراض ہو گا۔ اس نے سوچا اور اماں کا اور زیادہ خیال رکھنے لگی۔ ان کی کنگھی کرنا، انہیں وقت پر دوا دینا، کپڑے تبدیل کرنا۔ ان کے کمرے کا خیال رکھنا سارے کام اس نے ایک بار پھر اپنے ذمے لے لیے تھے۔ تب ہی کئی بار اس نے ڈائری میں [illegible]۔

"سوری مروان ناراض مت ہونا۔ میں اب اماں کا بہت خیال رکھوں گی۔" اس نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ منہ نے بی اے کر لیا تھا اور اس کے ابو نے اسے آگے پڑھنے سے منع کر دیا تھا لیکن وہ بی اے نہیں کر سکی تھی۔ منہ اسے اکساتی رہتی تھی۔

"پرائیویٹ بی اے کر لو سیمی، پڑھائی زندگی میں بہت کام آتی ہے۔" تب منہ کے بے حد اصرار پر [illegible] سال بعد اس نے بی اے کیا تھا پرائیویٹ کیا تھا اور [illegible] گیا تھا اور انہی دنوں خالہ جی بیٹے سے ملنے گئی تھیں ہمیشہ کی طرح۔ سال میں ایک بار وہ ضرور جاتی تھیں ملنے اور

دو دن بعد واپس آجاتی تھیں لیکن اس بار واپس آئیں تو دوبارہ جانے کے لیے۔ وہ بہت رو رہی تھیں۔

"میرا بیٹا بہت بیمار ہے اور میں اسے بیمار چھوڑ کر یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اس بار وہ کہہ رہا تھا مجھے معاف کر دو اور میرے پاس آجاؤ۔" سیمل انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ وہ چلی گئیں تب منہ نے فضیلت کو لگوا دیا۔

"ایماندار ہے اور نفتی بھی۔ اس کی ماں زمانوں سے ہمارے گھر کام کرتی ہے۔" شروع میں فضیلت کام کر کے چلی جاتی تھی۔ پھر منہ نے یونیورسٹی میں داخلے کا پروگرام بنا لیا۔

"تم بھی میرے ساتھ ایڈمیشن لے لو تو ابو مجھے آسانی سے اجازت دے دیں گے۔" منہ سے بڑی دو بہنیں تھیں ابھی ایک کی منگنی ہوئی تھی۔ دوسری کے لیے اچھے رشتے کا انتظار تھا۔

"اب کیا میں اپنی شادی کے انتظار میں فارغ بیٹھی رہوں۔ اتنے سال تو ہو گئے فارغ بیٹھے۔" منہ نے اپنی اماں کو قائل کر لیا تو اس کے ابو بھی راضی ہو گئے اور منہ اپنے ساتھ سیمل کو بھی گھسیٹ لے گئی تھی۔

"مروان چاہتا تھا کہ تم بہت پڑھو اور جو تو اس لیے ضروری ہے کہ تم گھر سے باہر نکلو۔" منہ نے ہی فضیلت کو اس کے یونیورسٹی سے واپس آنے تک گھر رہنے پر راضی کر لیا تھا۔ سیمل اسے اچھی تنخواہ دیتی تھی۔ فضیلت نے انکار نہیں کیا تھا اور اب تو دونوں فائنل ایئر میں تھیں۔

اتنے سال بیت گئے تھے ابا نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ تین سال پہلے جب وہ منہ اور اس کے بھائی کے ساتھ قبرستان گئی تھی تو اس نے قبرستان سے نکلتے ہوئے ابا کی جھلک دیکھی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے ابا نے اسے آواز دی ہو۔ وہ بھاگ کر روڈ پر آئی

ہیں؟" اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔ بسمل کو بھی اس کا تم کہنا برا نہیں لگا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" حیدر کی بیوی نے کچن سے باہر آ کر اسے سلام کیا تو نوشیرواں نے اس کا بھی حال احوال پوچھا۔

"آپا آپ اماں جان کو بتا دیں کہ نوشیرواں آ گئے ہیں۔" حیدر کی بیوی چلی گئی تو بسمل نے دیکھا وہ سر جھکائے پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔

"آپ نے بہت دن لگا دیے، اماں جان اداس ہو گئی تھیں۔"

"ہاں، دن کچھ زیادہ ہی لگ گئے۔" اس نے بغور بسمل کی طرف دیکھا۔

"وہ میں آپا کے ساتھ ادھر صفائی کروانے آئی تھی۔" اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر بسمل نے وضاحت کی۔

"میں نے آپ سے یہاں ہونے کی وضاحت تو نہیں مانگی بسمل۔ بلکہ مجھے اچھا لگا آپ کو یہاں دیکھ کر جیسے کوئی خواب تعبیر پا جائے۔ جیسے مدتوں بعد کوئی مسافر گھر آئے تو گھر میں وہی اس کا منتظر ہو جس کے منتظر ہونے کی اس نے چاہ کی ہو۔ سارے سفر کے دوران اسے سوچا ہو۔" بسمل نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تپش سے گھبرا کر بسمل نے نگاہیں جھکا لیں۔

"گل... گل کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں۔" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بسمل کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

"میں جان عالم سے ملا۔ وہ کہتا ہے گل کسی بھی قسم کی سرگرمی میں ملوث نہیں تھا۔ ہاں اپنے خاندان کے اتنے افراد کی موت نے اسے بالکل چپ کرا دیا تھا۔ وہ پشاور آنے کے بعد کئی دن تک بالکل چپ رہا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا تھا ایک دن وہ ایک تنظیم کے دفتر میں جا کر رائفل [illegible] سیکھنے لگا۔ وہ ایک ایسا قبائلی تھا بسمل جس نے بندوق نہیں پکڑی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا جان نہیں جانتا تھا لیکن پھر ایک دن اس نے بندوق پھینک دی۔

"نہیں میں یہ نہیں کر سکتا۔" اس روز وہ اپنے کمرے میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ بس وہ دن وہاں گیا تھا ابھی تو اسے صحیح طرح سے نشانہ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ بندوق نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں [illegible] ہوں۔ وہ لفظوں، پھولوں، رنگوں اور تتلیوں سے [illegible] کرنے والا تھا۔ شاعر۔ نازک دل شاعر۔ وہ آرمی میں نہیں گیا۔... اس نے ماموں کو صاف [illegible] دیا تھا کہ وہ آرمی میں نہیں جا سکتا۔ جان عالم کہتا ہے اس روز کے بعد وہ پھر چپ ہو گیا تھا۔ وہ تھا اس کا کمرہ اور اس کی کتابیں پھر ایک روز پتا نہیں کیوں کس [illegible] میں۔" وہ خاموش ہو گیا تو بسمل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہاں اخباروں میں اچھی خبریں نہیں آتیں ہر روز حملے۔ ہر روز مرنے کی اطلاع۔ تو پھر" بسمل پوچھنا چاہتی تھی کہ وہاں پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے اور نوشیرواں جیسے اس کے دل کی بات جان گیا۔

"ہاں، پتا نہیں کون لوگ ہیں اور ان کی پشت پر کون ہیں۔ کوئی غدار... بکے ہوئے لوگ۔ قبائل کی ساٹھ سالہ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے حکومت کے خلاف کچھ نہیں کیا پھر اب یک دم وہ ہیں یہاں دہشت گرد چھپے ہوئے ہیں۔ سرکاری [illegible] مارے جاتے ہیں۔ حملہ کرنے والے کون ہیں دہشت گرد... لیکن یہ دہشت گرد اچانک کہاں ہماری زمینوں پر اگ آئے ہیں۔" اس نے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور بے حد الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور میراں اماں اور ان کے پیچھے پیچھے فضیلت ہاتھ میں روح افزا کا جگ لیے آ رہی تھیں۔ نوشیرواں کھڑا ہو گیا۔ میراں اماں بے تابی سے اس کی طرف بڑھیں نوشیرواں نے انہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا۔

"ارے بچے گرمی سے گھبرا کر نہانے چلی گئی تھی میں کب آیا؟" وہ اس کی پیشانی چوم رہی تھیں۔

"میں نے کہا گرمی سے آئے ہیں چھوٹے صاحب تو فٹ ٹھنڈا شربت بناؤں۔" فضیلت نے جگ تخت پر رکھا۔ فضیلت نے اپنی کارکردگی جتائی تو بسمل مسکرا دی۔

"یہ تم نے اچھا کیا۔ اب فٹافٹ کچن سے گلاس بھی لے آؤ۔"

"یہاں تپش ہے بچے اندر کمرے میں چلو۔" نوشیرواں بیٹھنے لگا تو میراں اماں نے کہا۔

"میں اب جاتی ہوں اماں جان، کھانا ادھر سے بھجوا دوں گی۔" بسمل کھڑی ہو گئی تھی۔ نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ فریش ہو جائیں تو پہلے چائے بھجوا دوں۔" وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔ نوشیرواں کو لگا جیسے اندر دور تک کوئی مٹھاس سی گھل گئی ہو۔

"نہیں، میں کھانے کے بعد ہی چائے پیوں گا۔" وہ مسکرایا تھا اور بسمل دیوار پر سے دوسری طرف کود گئی تھی۔ جاتے جاتے اس نے سنا تھا میراں اماں کہہ رہی تھیں۔

"بسمل بہت اچھی بچی ہے شیری بہت محبت کرنے والی۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ..." اور بسمل ان کی پوری بات نہیں سن سکی تھی پھر کتنے ہی دن تک وہ اس نامکمل بات کو مکمل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

جبکہ میراں اماں نے بات مکمل کی ہی نہیں تھی اور ریوالونگ چیئر پر جھولتے ہوئے نوشیرواں عادل سوچ رہا تھا کہ کاش اماں جان بات مکمل کر دیتیں تو میں بھی اپنے دل کی خواہش ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتا اور کیا ہی اچھا ہو کہ میری اور اماں جان کی خواہش ایک ہو اور اس بے رنگ زندگی میں رنگ اتر آئیں۔ بلاشبہ بسمل خان بہت پیاری تھی اور پہلی نظر میں ہی وہ اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس روز وہ بہت دیر تک بسمل کے متعلق سوچتا رہا تھا حتیٰ کہ شام گہری ہو گئی اور میراں اماں نے مغرب کی نماز پڑھ کر اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ چیئر پر بیٹھا کمپیوٹر کی خالی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ میراں اماں نے لائٹ جلا دی۔

"مغرب ہو گئی اور تم اندھیرے میں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں اماں جان۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"بچے تم نے مغرب کی نماز بھی نہیں پڑھی۔"

"جی۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔ "مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ مغرب ہو گئی۔"

"کیا سوچ رہے تھے بچے؟" انہوں نے اس کی کشادہ پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کیے۔

"اماں جان دل بہت اداس ہے، کتنے گہرے سناٹے اتر آئے ہیں ہماری زندگی میں... اندر باہر ہر جگہ سناٹا ہے اور اب کیا یہ سناٹے ہمیشہ کے لیے ہمارا مقدر ہو گئے ہیں۔ جو چلے گئے وہ تو چلے گئے اور جو ہے وہ نہ جانے کہاں ہے۔ پتا نہیں ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو جانے کس اذیت کتنی تکلیف میں ہے میں تو گیارہ ماہ سے اسے کھوج کھوج کر تھک گیا ہوں، کہیں سے کوئی خبر کوئی پتا نہیں۔" اس کی خمدار پلکیں بھیگ رہی تھیں اور آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ اماں جان

اس کی کرسی کے پیچھے سے ہٹ کر اس کے سامنے پڑی چیئر پر بیٹھ گئیں۔

"شیری بچے ایسا کیا ہو گیا ہے جب سے طلاقے سے ہو کر آیا ہے اتنی ناامیدی اتنی مایوسی......"

"اب ہونے کو اور کیا رہ گیا ہے اماں جان۔"

"نہ بچہ ایسا نہیں کہتے، اٹھ کے دو نفل پڑھ کے اللہ سے صبر و استقامت مانگ۔ اللہ ہمارے گل کو ہم سے ملائے۔ وہ ہے نا ہمارے لیے امید کی کرن، آس کا تارا جینے کا آسرا۔"

"اماں جان۔" اس نے تھوڑا سا ان کی طرف جھکتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ "میں آپ جیسا حوصلہ اور صبر کہاں سے لاؤں۔ میرا دل پھٹ جانے کو ہے۔ وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ صرف ملبے اور اینٹوں کا ڈھیر۔ ویران بے آباد، آدھی گری، آدھی کھڑی دیواریں، ٹوٹی چھتیں، صرف ڈیڑھ سال پہلے وہاں ایک گھر تھا، ایک چار دیواری تھی جہاں زیمر بیٹے کی معصوم کھلکھلاہٹیں تھیں، جہاں زینے کو کڑے بھرتی تھی اور آپ کی ڈانٹ کھا کر ہنستی تھی، جہاں چاندنی راتوں میں چبوترے پر بیٹھ کر گل اپنی غزلیں اور نظمیں سناتا تھا اور سب اسے چھیڑتے تھے اور اب وہاں صرف دلدار ہے جو کسی ٹوٹی دیوار پر بیٹھ کر سارا دن روتا ہے اور آوارہ کتے ہیں جو اس کھنڈر میں دلدار کے چکر کھا کر چلاتے ہیں۔"

"بس کر بچے، بس کر کیوں ماں کا صبر آزماتا ہے اور اس کا سینہ چھلنی کرتا ہے۔" نوشیرواں عادل نے ان کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا تو میر اس اماں کا دل جیسے پانی بن کر آنکھوں سے بہنے کو بے تاب ہوا۔

☆☆☆

سمبل اپنے بیڈ پر بیٹھی اماں کو دیکھ رہی تھی۔ ان کا رخ اماں کی طرف تھا۔ اماں اپنے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں ایک دوسرے جوڑے وہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھیں۔ کیا اماں اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنی قسمت دیکھ رہی تھیں۔

"اماں کیا دیکھ رہی ہیں؟" کنگھی کے بل زرا اونچا ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"یہ۔۔۔" اماں نے اس کی طرف دیکھا۔

"ادھر آ۔" وہ اٹھ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں کو جوڑے ہوئے اماں نے دل کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں ہاتھوں کی لکیریں مل کر خوب صورت ب بنا رہی تھیں۔ اماں کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور تب اچانک اسے یاد آیا کہ اسکول میں لڑکیاں یونہی ایک دوسرے کے ہاتھ جوڑ کر ب بناتی تھیں۔ جس کی ب خوب صورت بنتی کہتیں اس کا شوہر خوب صورت ہوگا اور اماں کے شوہر خوب صورت تھے اور کیا وہ واقعی خوب صورت تھے؟ اس نے سوچا اور واپس اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ کل سے اس کا دل بہت اداس تھا۔ آج یونیورسٹی بھی نہیں گئی تھی۔ حمنہ نے بھی چھٹی کر لی اس نے صبح اماں کا حال بھی نہیں پوچھا تھا اور نوشیرواں ۔۔ وہ پتا نہیں گھر پر ہے یا ۔۔۔ ایک لمحے کے لیے اس نے نوشیرواں کو سوچا تھا دوسرے لمحے وہ پھر اماں کو دیکھنے لگی تھی۔ جو ہتھیلیاں جوڑے ابھی تک اپنے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھیں۔

"اماں آپ کو پتا ہے کل سولہ جون ہے سولہ جون۔" اس نے دل ہی دل میں انہیں مخاطب کیا۔ کاش سولہ جون کبھی نہیں آتی۔ وہ سولہ جون کو کیلنڈر کے صفحات سے نکال سکتی۔ اس نے آنکھوں کی نمی ہتھیلیوں کی پشت سے صاف کیا اور کھڑی ہو گئی۔

"اماں چلیں باہر بیٹھتے ہیں۔ یہاں اندر گھٹن ہے۔" اماں نے دونوں ہاتھ نیچے کیے اور نفی میں سر ہلایا۔ تب وہ خود ہی اٹھ کر باہر آ گئی۔ اوپر آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔

"مجھے یہ گھر اس لیے پسند ہے کہ یہاں صحن میں سے اوپر آسمان نظر آتا ہے اور آسمان پر جگمگ جگمگ کرتے ستارے بالکل دادا جان کی حویلی کی طرح وہاں سے بھی آسمان ایسا ہی نظر آتا تھا لیکن۔" قریب سے ہی مروان کی سرگوشی سنائی دی تھی اس نے برآمدے میں کھڑے کھڑے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

"مروان۔" اس کے لبوں سے سسکی نکلی اور وہ تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہ رہے تھے۔ اس نے دونوں پاؤں تخت پر رکھ لیے تھے اور گھٹنوں پر سر رکھے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ روتے روتے اس کی سسکیاں بلند ہو گئی تھیں۔

نوشیرواں اماں کو نماز میں مشغول دیکھ کر پھر باہر آ گیا تھا اب وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔ جون کے اس تپتے دن کی رات خوشگوار تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور ہوا میں تپش بھی نہیں تھی۔ آٹھ سال پہلے وہ پندرہ جون کی رات تھی جب وہ ایک ماہ سیکنڈ لیفٹیننٹ پر ڈیوٹی دینے کے بعد کارگل سیکٹر میں آیا تھا۔ وہ نومبر سے جنوری تک سیاچن میں پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر خون جما دینے والی سردی کی شدت چار سو برف ہی برف تھی میں [illegible] کی شدید سردی کے باوجود وہ ان برف زاروں میں ڈیوٹی دیتا رہا تھا۔ اس کے پاؤں frostbite کا شکار ہو چکے تھے لیکن ڈاکٹروں کے علاج کے بعد وہ معجزانہ طور پر بھر آ گیا تھا۔ پندرہ جون کی اس رات جہاں وہ کھڑا تھا وہاں ہوا تیز چل رہی تھی۔ دشمن کی سنسناتی گولیاں بارود اگلتی توپیں [illegible] کے اندر نیچے ہاتھ کی پوروں کے نشان [illegible] ہے تھے کیپٹن خان کی قیادت میں [illegible] سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے [illegible] سے پہلے جو دل ہی دل میں دعا [illegible] تھا کیپٹن خان سے اس کی دوستی اسکردو میں ہوئی تھی۔ کیپٹن خان بہت پر جوش تھے پھر انہوں نے کئی اہم چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا اور جب بھارتی فوجی چوکیوں سے فرار ہو رہے تھے تو کسی فوجی نے دستی بم پھینکا تھا اور بم کے کئی ٹکڑے اس کی ٹانگ میں گھس گئے تھے۔ جب وہ اسے کیمپ میں لے جا رہے تھے تو کیپٹن خان نے وکٹری کا نشان بنایا تھا اور اس نے بھی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ اور پھر عارضی قائم کیے اسپتال میں جب اس کی ٹانگ سے بم کے ٹکڑے نکالے جا رہے تھے تو اس نے سنا کہ دشمن نے گن شپ ہیلی کاپٹروں سے گولیوں اور بموں کی بارش کر دی تھی اور یہ سولہ جون تھی جب اسے راولپنڈی بھجوانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں جب کسی نے بتایا کہ کیپٹن خان شہید ہو گئے۔ یقیناً کیپٹن خان نے ابدی زندگی پالی تھی لیکن پچھلے ایک سال سے ان کا ساتھ تھا۔ اسکردو میں، جو ات آرمی میس میں مجہال پوسٹ پر ہر جگہ وہ ساتھ تھے۔ اسٹریچر پر لیٹے لیٹے نوشیرواں نے کیپٹن خان کے لیے بہت سارے آنسو بہائے تھے۔ جب اسے ہیلی کاپٹر میں منتقل کیا جا رہا تھا وہ تب رو رہا تھا۔

صحن میں ٹہلتے ٹہلتے نوشیرواں کو لگا جیسے اس کے رخسار بھیگ رہے ہوں۔ اس نے ہاتھ رخسار پر رکھے تو وہ بھیگ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شہادت اس کا نصیب کیوں نہیں بنی۔۔۔ تب اس نے سوچا تھا لیکن جب وہ ایک ایک کر کے [illegible] بنا کر کھڑا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ شاید اللہ نے اس دن کے لیے اسے بچایا تھا کہ اسے ان پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے مٹی دے دینا تھا اور میں اس اماں اور گل کو سہارا دینا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رکا۔ [illegible] گھر کی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ فضا میں رات کے پھولوں کی مہک تھی اور سناٹے میں

کسی کی سسکیاں سنائی دی تھیں اور یہ سسکیاں دیوار کے اس طرف سے آرہی تھیں۔

''کیا یمل ــــ؟'' وہ بے قرار سا ہو کر دیوار کے قریب چلا گیا۔ خاموشی اور سناٹے میں سسکیاں بہت واضح تھیں۔

''پتا نہیں یمل اتنا روتی کیوں ہے؟ ہمیشہ اس کی پلکیں بھیگی دکھتی ہیں اور غزال آنکھوں میں شکاریوں کے ڈر سے بھاگنے والی ہرنی کا سا ڈر اور ساتھیوں سے بچھڑ جانے کا ملال ہوتا ہے۔

''کیا وہ مردان کو یاد کر کے روتی ہے اور کیا اسے اپنے ابا کا خوف ہے لیکن اس نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ اسے اپنے ابا سے کیا خوف ہے۔'' وہ بے چین سا مڑا تو اس نے دیکھا میراں اماں نماز سے فارغ ہو کر اس کے کمرے سے باہر آرہی تھیں۔ برآمدے میں آکر انہوں نے نوشیرواں کی طرف دیکھا۔

''شیری بچہ دو پھلکے پکا لوں تیرے لیے۔''

''ابھی نہیں اماں جان۔'' وہ برآمدے میں آگیا۔

''دس تو بجنے والے ہیں بچہ پھر کس وقت کھائے گا۔ میں پھلکے ڈال لیتی ہوں تو اتنے میں مائیکرو میں سالن گرم کر لے۔''

''اماں جان۔'' ان کی بات کا جواب دیے بغیر اس نے بے قراری سے کہا۔ اماں جان اُدھر سے رونے کی آواز آرہی ہے۔ شاید یمل رو رہی ہے۔''

''ہاں وہی روتی ہوگی۔''

کیوں اماں جان وہ کیوں روتی ہے اتنا۔ کیا مردان کے لیے؟''

''ہاں بچہ۔'' میراں اماں تخت کے کونے پہ ٹک سی گئیں۔ ''نازک ہے کمزور دل ہے اور دکھ اس کی طاقت اور ہمت سے زیادہ۔ جب ہمت جواب دے دیتی ہے تو ـــــ میں نے اکثر راتوں کو اسے روتے اور مردان سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔''

''تو اماں جان۔'' وہ بھی وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ ''وہ کیوں نہیں مردان سے کہتی کہ وہ آجائے۔'' یمل کے آنسو اس کے دل پر گرتے تھے اور سسکیاں سماعت کو اذیت دیتی تھیں۔ میراں اماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''پاغلا (پاگل) بھلا اُدھر سے بھی کوئی آسکتا ہے۔''

''اماں جان۔'' ان کی بات کا مطلب سمجھے بغیر نوشیرواں جھنجلایا۔ ''آج کل فاصلے سمٹ گئے ہیں یہ کینیڈا ہو یا دنیا کا آخری کنارہ جس نے آنا ہو وہ آجاتا ہے۔'' اماں جان نے ایک گہری سانس لی۔

''پر اُدھر سے کب کوئی آیا ہے، آسکتے تو ہم زہے بشمو، خانیاں منہ دو سب کو نہ بلا لیتے پاغلا۔''

''کیا مردان ــــ؟'' نوشیرواں کا منہ کھلا رہ گیا۔

''ہاں بچے۔''

''نہیں۔'' وہ ابھی تک حیرت سے اماں جان کو دیکھ رہا تھا۔ ''پر وہ تو ایسے بات کرتی ہے مردان کی جیسے وہ زندہ ہو اور اس سے بات کرتا ہو۔ اس کی بات سنتا ہو۔''

''ہاں، اس نے اپنے اندر اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ اپنی ڈائری میں لکھ کر اس سے باتیں کرتی ہے۔ جس صبح تو آیا تھا اس کو پوری رات وہ جاگی ہے، میں دیکھ رہی تھی اس کی بے چینی اور تڑپ اور اب آج رات بھی کہاں سو پائے گی کل سولہ جون ہے۔ سولہ جون کو ہی مردان شہید ہوا تھا۔ ادھر کارگل سیکٹر میں تو بھی تو اُدھر رہا ہے شیری۔ جانتا ہوگا اسے 16 جون، مردان کیپٹن مردان خان شہید، لاہور۔ وہ 24 کا تھا۔

مردان خان جسے وہاں سب کیپٹن خان کہتے تھے اور جو ناٹ آرمی میس میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسے روئی کہتے تھے۔ وہ جوان سال کیپٹن حسام اسے بیٹھ مولا: روئی کہتا تھا۔ روئی اس کا نک نیم تھا اور کیپٹن حسام اس کا کالج کا ساتھی۔ کیپٹن خان جو اکثر رات میں اور جو سیاچن کی برف پر بیٹھ کر کھلے آسمان تلے اپنی گڑیا کی باتیں کرتا تھا۔ جو اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی اس کے پاس گڑیا کے علاوہ اور کوئی موضوع ہوتا نہیں تھا۔ وہ گڑیا کے ساتھ ماموں چاچا سے پرانی کتابیں خریدتا تھا۔ اسے کہانیاں سناتا تھا۔ کتنی ہی باتیں اس نے نوشیرواں سے شیئر کی تھیں۔

''ماموں چاچا ہمارے لیے اچھی کتابیں الگ کر کے رکھ دیتے تھے۔'' 14 جون کی صبح کارگل محاذ کے متعلق باتیں کرتے کرتے اچانک اس نے کہا تھا۔

''اور شاید اب گڑیا کبھی ماموں چاچا سے کتابیں خریدنے نہیں جا سکے گی۔ وہ اکیلا تو کبھی گئی ہی نہیں اور ماموں چاچا ہمارا انتظار کرتا رہے گا۔ تم کبھی لاہور جاؤ شیری تو ماموں چاچا کو ضرور بتا دینا۔'' اس نے کیپٹن خان کو ٹوکا نہیں تھا۔ وہاں سب ہی شہادت سے کچھ قدم دور بیٹھے تھے۔

''مجھے شہادت کی خواہش تو ہے لیکن مجھے اماں اور گڑیا کا خیال آتا ہے۔'' پندرہ جون کو جب اسے آخری بار وہ دیکھ رہا تھا تو اس نے کہا تھا۔ وہ بھی ماموں چاچا سے ملنے لاہور نہیں جا سکا تھا۔ کیا پتا وہ اب بھی کیپٹن مردان کا انتظار کرتا ہو اور ان کے لیے اچھی کتابیں چھانٹ کر رکھتا ہو۔ میراں اماں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''اچھا میں اب روٹیاں بنا لوں؟'' انداز سوالیہ تھا۔ اس نے سر ہلا دیا تھا حالانکہ اس کا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اور اگر وہ نہ کھاتا تو پھر میراں اماں بھی بھوکی ہی سو جاتیں۔ میراں اماں کچن میں چلی گئی تھیں وہ اٹھ کر پھر صحن میں آگیا تھا۔ دیوار کے اس پار سے اب بھی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، وقفے وقفے سے اور اس کا دل دیوار سے ٹکرا کر لوٹتا تھا۔ کاش وہ یمل کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن سکتا۔ اس کے اس غم پر اسے تسلی دے سکتا۔ سسکیاں تھم گئی تھیں شاید وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی، اس نے سوچا اور میراں اماں کی طرف دیکھا جو کچن سے نکل کر روٹیاں پکنے کا بتا رہی تھیں۔ اس نے صحن میں پھیلی موتیے کی مہک کو سانس کے ذریعے اندر اتارا اور برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔

یمل روتے روتے تھک گئی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کیا اور سامنے لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ جب کی مدھم روشنی

غزل

وصل بہار میں کٹ جائے غنچہ تو عزم رکھتا ہے
گر نہ ہو امید وفا تو قدم رکھتا ہے

رکھتا تو ہے وہ بھی زبان منہ میں
نہ جانے کیوں، کچھ کہنے سے صنم رکھتا ہے

میدان الفت میں ہم ہار گئے ان سے
بات تو ہے سچ مگر پھر بھی قلم رکھتا ہے

نئے چہرے، نئی باتیں، نئے وعدے
ایسا کرنے سے کہاں دل یہ قلم رکھتا ہے

آج اس کے چہرے پہ وہ مسکان نہ تھی
نہ دیکھوں جس کو خضر تو دم رکھتا ہے

شاعر: محمد امین خضر

مرسلہ: میمونہ عزیز، کراچی

تھی۔ وہ ان کے لیے چائے کے ساتھ کباب اور کیک لے کر آئی تھی۔ رات سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ رغبت سے کباب کھاتی رہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے انہوں نے اس طرح رغبت سے کبھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ خود ہی انہیں کھلاتی تھی تو وہ ایک روبوٹ کی طرح کھالیتی تھیں۔

''اماں اگر آپ کو بھوک نہیں ہو تو کھانا لے آؤں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تو پھر اس نے ان کے کپڑے تبدیل کروائے، ان کی کنگھی کی اور ان کو باہر لے آئی تھی۔ باہر موسم اچھا تھا۔ ہوا میں مٹی کی خوشبو اور نمی تھی شاید کہیں بارش ہوئی تھی۔ اماں کو تخت پر بٹھا کر وہ خود بھی تخت پر بیٹھ کر ان سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ یونیورسٹی کی، حسن کی، میراں اماں کی لیکن آج ان باتوں میں وہ جان بوجھ کر مروان کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔ ورنہ اماں کے ساتھ اس کی باتوں میں صرف مروان کا ہی ذکر ہوتا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا اماں ٹھیک ہو جائیں گی۔ بالکل پہلے جیسی لیکن سب کچھ پہلے جیسا تو نہیں ہوگا مروان نہیں ہوگا۔ اس نے افسردگی سے اماں کی طرف دیکھا جو بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں اور اب اسے چپ دیکھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''کیا دیکھ رہی ہیں اماں؟'' یمل نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا لیکن وہ کچھ الجھی الجھی سی نظر آ رہی تھیں۔ اور یہ بھی تو بہت تبدیلی تھی کہ اماں اس کی بات کا جواب دے رہی تھیں پھر وہ یکایک اٹھیں، تخت سے اتر کر چپل پہنے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ یہ سب جو اماں کر رہی تھیں پچھلے کئی سالوں کی روٹین سے مختلف تو۔ وہ ان کے پیچھے ہی کمرے تک گئی تھی وہ اپنے بیڈ پر لیٹ رہی تھیں۔

''کیوں اماں! آپ تھک گئی ہیں۔ سوئیں گی کیا؟''

''ہاں!'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کروٹ بدل کر رخ دیوار کی طرف کر لیا۔ اب ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ یمل کچھ دیر کھڑی ان کی پشت دیکھتی رہی پھر واپس باہر آ گئی۔ باہر شام کی اداسی پھیل رہی تھی۔ سورج کا سرخ گولا افق کے کنارے پر تھا اور بس کوئی دم میں غروب ہونے والا تھا۔ سارا دن گزر جاتا ہے لیکن شام اتنی اداس اتنی افسردہ کیوں ہوتی ہے۔ وہ ایک بار پھر تخت پر بیٹھ گئی تھی۔ شامیں اسے ہی اداس لگتی ہیں یا پھر ہوتی ہی اداس ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پرندوں کی قطاریں اپنے گھونسلوں کی طرف جا رہی تھیں۔ صبح ہوتے ہی یہ جانے کہاں کس تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ شاید رزق کی تلاش میں اور پھر شام ہوتے ہی گھروں کی طرف۔ صبح سفر پر جانے والے سارے پرندوں میں شاید کوئی ایسا بھی ہوتا ہوگا جو واپس نہ پلٹ پاتا ہو۔ وہ یونہی اوٹ پٹانگ الٹی سیدھی باتیں سوچ رہی تھی۔ یکدم اس کی نظر میراں اماں کے گھر کی دیوار پر پڑی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیکھوں میراں اماں کیا کر رہی ہیں۔ وہ غیر ارادی طور پر چلتے ہوئے صحن کی دیوار کے پاس آئی اور کرسی پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھا۔ میراں اماں تو کہیں نہیں تھیں ہاں نوشیرواں دیوار سے ٹیک لگائے تخت پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر یونہی کھڑی نوشیرواں کو دیکھتی رہی۔ برآمدے میں اب ہلکا سا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن نوشیرواں پڑھ رہا تھا اسے لگا جیسے وہ بہت اداس ہو۔ وہ واپس اترنے لگی تھی جب نوشیرواں کو اس کی جھلک نظر آ گئی تھی۔

''یمل'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

اور وہ اٹھ کر صحن میں آ گیا تھا اس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کی ڈائری تھی شاید۔ سیمل نے اسے دیکھا اور سلام کیا۔ وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کہاں تھیں آپ؟ نظر ہی نہیں آئیں۔"

"گھر پہ ہی تھی۔"

"اماں جان سے کوئی کام تھا کیا؟"

"نہیں تو بس ایسے ہی۔" وہ گھبرائی۔

"اماں جان صبح آئی تھیں۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جی، اب کہاں ہیں وہ؟"

"سامنے آمنہ آپا کے گھر گئی ہیں ان کے بیٹے کو بخار تھا۔"

"اچھا۔" وہ مڑی۔

"سنیں۔" اب وہ صحن کی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔

"اماں جی کیسی ہیں؟"

"بہت بہتر۔" اس کی آنکھیں یکدم چمکنے لگیں اور وہیں کرسی پر کھڑے کھڑے اس نے صبح اور رات کی کیفیت بتا ڈالی۔

"تو مجھے بتاتیں میں ڈاکٹر کی طرف لے جاتا۔"

"جی وہ حمنہ کا بھائی ہے نا وہ لے آیا تھا ڈاکٹر عرفان کو۔"

"اچھا۔" نوشیرواں یکدم ہی سنجیدہ ہو گیا اور واپس مڑ گیا..... مسجد میں مغرب کی اذان شروع ہو گئی۔ وہ کرسی سے نیچے اتری اور حیرت سے سوچا یکدم نوشیرواں کو کیا ہو گیا تھا۔ کیا اسے برا لگا کہ حمنہ کا بھائی ڈاکٹر عرفان کو گھر کیوں لایا۔ پہلے بھی تو وہی جب نوشیرواں اس گھر میں نہیں تھا تو وہ پھر بھلا اس میں برا ماننے کی کیا بات تھی ایسے ہی مجھے وہم ہوا۔ اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اب بھی پرندوں کی قطاریں تیزی سے پرواز کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہی تھیں۔ اس نے برآمدے میں آ کر بلب جلایا اور وضو کرنے چلی گئی۔

یہ رات بھی پچھلی رات کی طرح بے سکون ہی گزری تھی پھر بھی وہ وقت پر اٹھ گئی تھی۔ آج اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ ایک دو روز میں یونیورسٹی گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند ہو رہی تھی اور پھر اگست میں ان کے فائنل پیپرز ہونے تھے۔ 18 جون لاسٹ ورکنگ ڈے تھا۔ حمنہ نے اسے بتایا تھا پریویس والے فیئرویل پارٹی بھی دے رہے تھے۔ پتا نہیں اب یا چھٹیوں کے بعد، یہ آج ہی پتا چلنا تھا۔ نفیسہ کو اماں کے متعلق سمجھا کر وہ صرف ایک کپ چائے پی کر گھر سے نکل آئی تھی۔ گلی عبور کر کے اس نے حمنہ کے دروازے پر دستک دی۔ حمنہ تیار ہی تھی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھیں جب اس نے ایک گلی سے نوشیرواں عادل کو آتے دیکھا۔ ایک پاؤں پر زور دے کر وہ بے حد تکان سے چل رہا تھا۔ حمنہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"ابو بہت تعریف کرتے ہیں نوشیرواں کی میراں اماں تو خیر ہیں ہی پورے محلے کی جان" سیمل نوشیرواں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کے پیکٹ تھے۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکا تھا۔ حمنہ اور سیمل نے ایک ساتھ سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دے کر سیمل کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے رات بھر جاگتا رہا ہو۔

"اماں جان کی طبیعت بہت خراب تھی رات یکدم تیز بخار ہو گیا تھا۔ رات بھر پٹیاں رکھتا رہا۔ ابھی بخار کم ہے کچھ۔" سیمل یکدم پریشان نظر آنے لگی تھی۔ نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔

"پریشانی والی کوئی بات نہیں، ابھی ٹھیک

ہے تو واپسی پہ میڈیسن لے لوں گا۔" وہ اسے تسلی دیتا ہوا چلا گیا تو حمنہ نے رائے ظاہر کی۔

"اب میراں اماں کو اپنے نواسے کی شادی کر دینی چاہیے۔" سیمل خاموش رہی۔ وہ میراں اماں کے لیے بے حد پریشان تھی۔ یونیورسٹی سے آ کر وہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر میراں اماں کی طرف گئی۔ وہ سو رہی تھیں اور نوشیرواں ان کے پاس ہی کرسی پہ نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی براؤن ڈائری تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب اماں جان کی؟" وہ دروازے میں کھڑی پوچھ رہی تھی۔ نوشیرواں چونک کر یکدم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ حسب معمول دیوار پھلانگ کر آئی تھی۔

"اب بہتر ہیں۔"

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟" اس نے دروازے پہ کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کچھ نہیں موسمی بخار ہے۔" وہ بہت گہری نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "آ جائیں پلیز وہاں ہی کیوں کھڑی ہیں۔"

"نہیں، چلتی ہوں اماں جان تو سو رہی ہیں، شام کو آ جاؤں گی۔" وہ مڑی اور ابھی وہ برآمدے میں ہی تھی کہ وہ بھی باہر آ گیا، ہاتھ میں وہی ڈائری تھی۔

"سیمل۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ سیمل نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھیں نا پلیز کچھ دیر تو ...... آپ سے کچھ باتیں کرنا تھیں۔" سیمل نے صحن میں پھیلی دھوپ کو دیکھا۔ بادل چھائے رہے تھے لیکن باہر تپش تھی اور دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ سیمل مسکرائی اور تخت پہ بیٹھنے لگی تھی کہ بے اختیار نوشیرواں نے کہا۔

"یہاں بہت تپش ہے۔ اندر آ جائیں پلیز میرے روم میں۔" سیمل نا سمجھ کے ہولے ہولے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا تھا اور دروازہ کھول دیا۔ سیمل نے دیکھا اس کے بیڈ پہ کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کمپیوٹر ٹیبل پہ بھی کچھ ڈائریز پڑی تھیں۔ سیمل نے بیڈ پر سے کتابیں ایک طرف کیں اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ ذرا سا شرمندہ ہوا۔

"دراصل میں کل سے اپنے کمرے میں نہیں آیا۔" وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اماں جی کیسی ہیں اب؟"

"بہت بہتر ابھی سو رہی تھیں۔ نفیسہ ہے ان کے پاس۔"

"سیمل مجھے آپ سے مروان کے متعلق بات کرنا تھی۔"

"جی......!" سیمل چونکی۔

"مجھے کل ہی اماں جان نے بتایا کہ مروان ....." سیمل نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

"مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ آپ کیپٹن مروان خان کی سسٹر ہیں۔ میں سمجھتا تھا شاید مروان کہیں کینیڈا یا امریکا گیا ہوا ہے۔ وہ تو اماں جان نے بتایا کہ مروان کارگل میں سولہ جون کو... سیمل، میرا اور مروان کا تقریباً چھ سات ماہ ساتھ رہا تھا۔ ہم سیاچن پر اور پھر کارگل میں ... جس صبح وہ شہید ہوا اس رات بھی کارگل کے محاذ پر ہم اکٹھے تھے۔ مجھے زخمی ہو کر پیچھے آنا پڑا اور وہ — وہ بہت پیارا شخص تھا اور آپ کے متعلق بہت باتیں کرتا تھا۔ جب بھی ہم فارغ بیٹھتے وہ آپ کا ذکر کرتا ... آپ کا شوق، آپ کی دلچسپیاں، آپ کی باتیں کرتے کرتے وہ تھکتا ہی نہیں تھا۔" سیمل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے

تب ہی یہ شخص اچانک لگتا تھا کہ یہ مروان کا دوست تھا۔ اس کا جی چاہا وہ اس سے مروان کے ایک ایک لمحے کی تفصیل پوچھے جو لمحے اس نے نوشیرواں کے ساتھ گزارے تھے لیکن وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تو نوشیرواں نے مضطرب ہو کر کہا۔

"پلیز بسمل رو مت۔ مروان کو اللہ نے بہت بڑا اعزاز عطا کیا۔ شہادت کا اعزاز۔" پتا نہیں اب یہ اعزاز بڑا تھا یا اس کا دکھ بڑا تھا۔ مروان کے بچھڑ جانے کا دکھ، اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکنے کا دکھ۔ ان آٹھ سالوں میں ایک بار بھی اس نے اس کی شہادت پر فخر نہیں کیا تھا۔ ہاں صرف دکھ تھا اندر باہر ہر جگہ دکھ ——— وہ تو بہت معمولی بہت عام سی لڑکی تھی وہ اپنے بھائی کے بچھڑ جانے پر روتی تھی۔ وہ بھائی جو ہمیشہ اس کا سائبان رہا تھا جس نے ہمیشہ اس کے آنسو پونچھے اس کے درد و دکھ۔ جو صرف اس کی خاطر گھر چھوڑ آیا کہ وہ مضطرب نہ ہو، وہ جنوری میں آخری بار گھر آیا تھا پھر ——— جنوری سے جون تک کے ہر دن ہر لمحے کی باتیں وہ جاننا چاہتی تھی وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ کیسا تھا، ان پانچ ماہ میں اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی تھی۔ وہ کمزور ہو گیا ہوگا، اتنی سردی میں جب وہاں برف جمتی تھی اور ——— وہ یہ سب پوچھنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اندر ہی کہیں گم ہو گئے تھے۔

"بسمل پلیز......" نوشیرواں نے پھر التجا کی تو اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھ کر حسب معمول دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"ہم میں سے وہاں سب ہی شہادت کے تمنائی تھے لیکن قدرت جسے منتخب کر لے یہ"

"کاش ان میں سے کسی کو یہ اعزاز مل جاتا جو اس کا تمنائی تھا اور مروان کو کچھ نہ ہوتا۔" اس نے دلگرفتگی سے سوچا تھا۔

"اور کیا فخر ہوتا ہے جیت ... جانی۔

لا حاصل رہتا ہاں۔" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ نوشیرواں کا رنگ لمحہ بھر کو تبدیل ہوا اور اس نے بے حد سنجیدگی سے بسمل کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ اس کی ناک بے حد خوب صورت سرخ ہو رہی تھی اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"بہت سارے لوگ نہیں جانتے لیکن ——"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ رول کیا نقشہ میز پر پھیلایا۔ یہ وہی کارگل کا نقشہ تھا۔ "یہ دیکھ رہی ہو؟" اس نے اشارے سے بسمل کو قریب بلایا۔ "یہ کارگل کی پہاڑیاں ———" بسمل اس کے قریب کھڑی خاموشی سے نقشے کو دیکھ رہی تھی۔

"پاکستان کے نقطۂ نظر سے اس علاقے کی اہمیت ایک اور وجہ سے بھی ہے کہ دریائے سندھ کا آغاز کارگل کے آس پاس کی پہاڑیوں سے ہی ہے۔ آپ جانتی ہو کارگل کی جنگ کیوں ہوئی" اس کے بعد اس نے اپنا رخ موڑ کر بسمل کی طرف دیکھا تو بسمل نے نفی میں سر ہلایا۔

"کارگل کا منصوبہ زبردست دفاعی اہمیت کا حامل تھا۔ ہم نے یہاں بہت قیمتی جانیں قربان کیں بسمل ——— ایک مقصد تھا کہ کشمیر کاز کو عالمی سطح پر اجاگر کیا جائے لیکن ——— شاید ہم ———" وہ جیسے کسی گہرے دکھ میں ڈوب گیا اور رخ موڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بسمل ابھی تک نقشے کے پاس کھڑی نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ کارگل کی جنگ کیوں ہوئی تھی۔

"تم بیٹھو بسمل میں آتا ہوں۔" پھر وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ بسمل وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ میز پر وہ براؤن ڈائری الٹی پڑی تھی۔ اس نے بے خیالی میں اسے اٹھایا اور پھر وہ چونک گئی۔

باقی آئندہ ماہ

کوئی شہر ایسا بساؤں میں!

نگہت سیما

آخری حصہ

سبیل نے نوشیرواں کی ڈائری اٹھا کر دیکھی تو اس میں محسن نقوی کی نظم لکھی تھی۔

کوئی شہر ایسا بساؤں میں
میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں
جہاں سچ کو سچ سے ہو واسطہ
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں چاند ماند نہ ہو کبھی
جہاں خوشبوؤں کو بدلتی رُت سے حسد نہ ہو
جہاں خواب آنکھوں میں جگمگائیں تو
جسم و جاں کے کبھی دریچوں میں تیرگی کا گزر نہ ہو
کوئی رات ایسی بسر نہ ہو
کہ بشر کو اپنی خبر نہ ہو
جہاں داغ داغ سحر نہ ہو
جہاں کشتیاں ہوں رواں دواں
تو سمندروں میں بھنور نہ ہو
جہاں برگ و بار سے اجنبی
کوئی شاخ کوئی
شجر نہ ہو

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں

اسے مروان یاد آ رہا تھا۔ مروان کو یہ نظم کتنی پسند تھی۔ وہ اکثر اسے سناتا تھا۔

''کیا ایسا ممکن ہے ثریا کہ کوئی ایسا شہر ہو جہاں کوئی غم کوئی دکھ نہ ہو جہاں سب خوش اور مطمئن ہوں۔''

نوشیرواں جوس کے گلاس لیے اندر آیا اور گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ۔۔۔گل کی ڈائری ہے مجھے عالم نے دی تھی۔ ہیم ہمارا گل اندر سے ایک نازک دل شاعر تھا۔'' وہ اپنا گلاس اٹھا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ''اس میں اس کی اپنی نظمیں اور شاعری بھی ہے اور دوسروں کی بھی۔''

''مروان کو بھی یہ نظم بہت پسند تھی۔'' اتنی دیر میں پہلی بار سبیل نے کچھ کہا تھا۔

''عالم نے مجھے بتایا تھا۔'' نوشیرواں نے افسردگی سے کہا۔ ''ہم ملک میں آئے دن ہونے والی دہشت گردی سے بے گناہ لوگوں کے مرنے سے، کرپشن سے، ہر چیز سے نالاں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اس کے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہوتی تو اسے گھما کر سب کچھ ٹھیک کر دیتا۔ یہ وہ آخری نظم ہے جو اس نے اس ڈائری میں نوٹ کی ہے۔ اس کے بعد صفحے خالی ہیں۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا وہ۔۔۔ کون سا شہر بسانے اور کہاں۔۔۔''

نوشیرواں نے سر جھکا لیا اور ہاتھ میں پکڑا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''سبیل تم گل کے لیے بھی دعا کیا
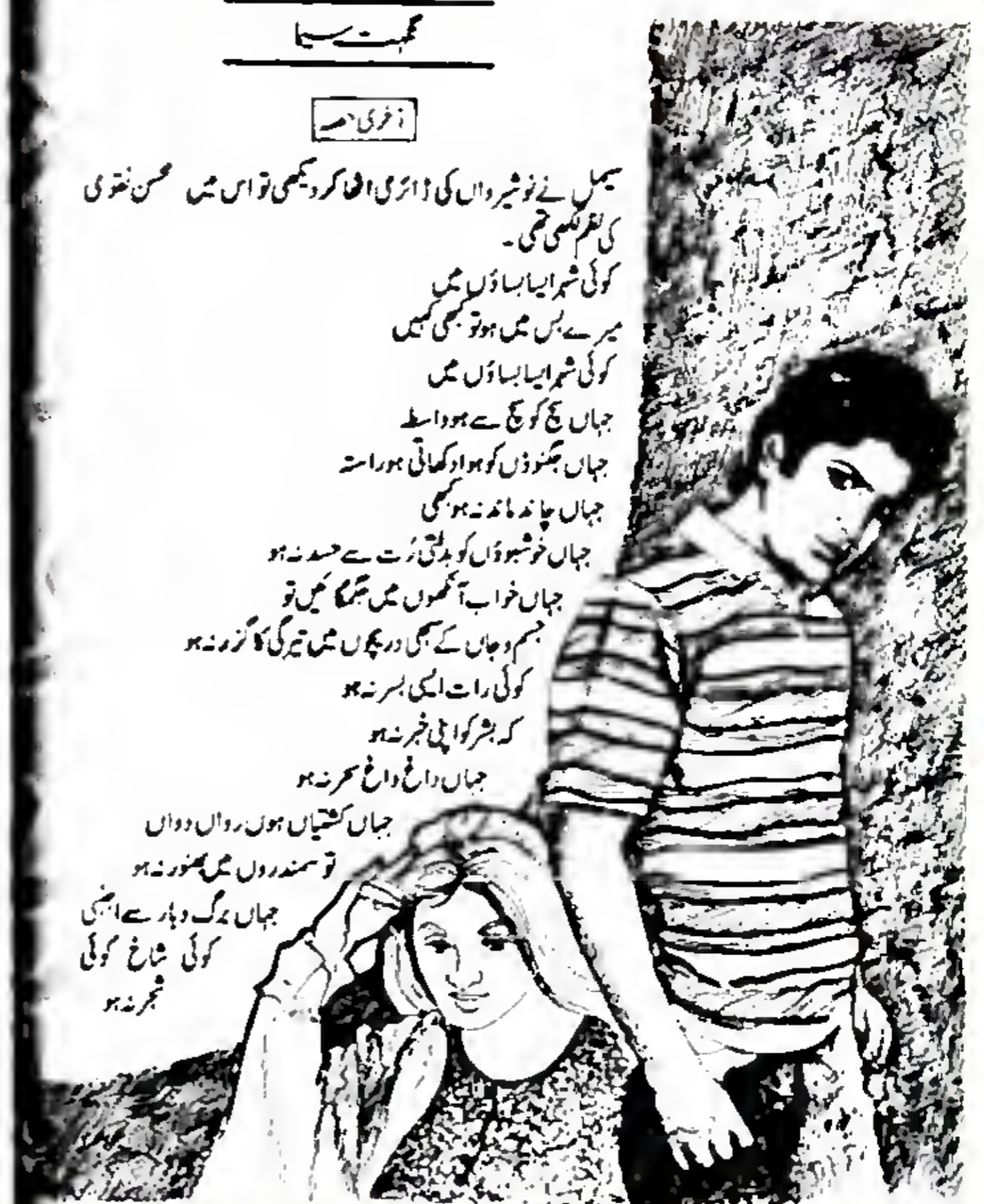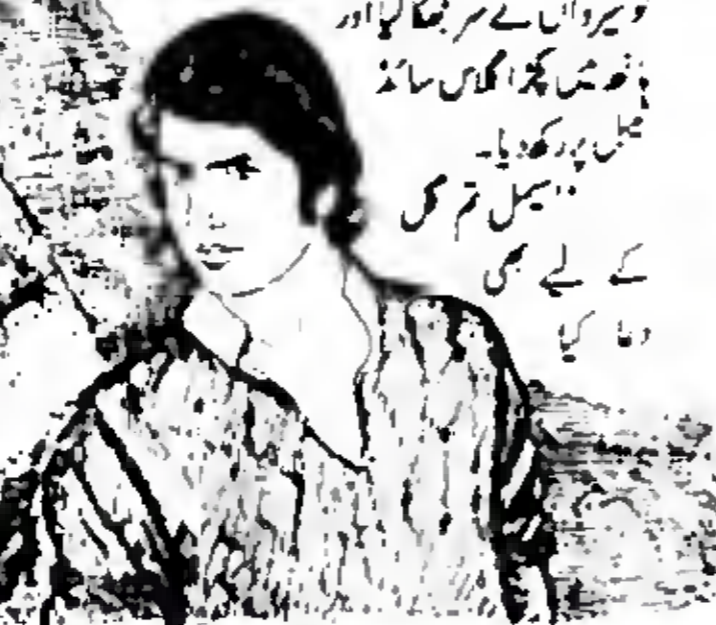
کرو۔ بس وہ مل جائے، ایک بار کہیں سے آجائے تو پھر میں اسے اس طرح چھپا کر رکھوں کہ کوئی اسے کچھ نہ کہہ سکے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میرے نانا کی نسل ختم ہو جائے گی۔" سیمل کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا وہ یونہی ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی رہی۔

"ارے تمہارا جوس گرم ہو جائے گا پی لو نا۔" اس نے اچانک کہا تو سیمل نے جوس کا گلاس اٹھا لیا۔ اگرچہ اس کا پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جوس پی کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے، فضیلت نے گھر جانا ہوگا۔" وہ باہر نکلی تو دھوپ صحن سے ختم ہو کر اب صرف دیواروں پر تھی۔ نوشیرواں برآمدے میں کھڑا اسے سیڑھی پر چڑھتے اور پھر دیوار پر پاؤں رکھ کر دوسری طرف اترتے دیکھتا رہا۔ دل نے بڑی شدت سے خواہش کی کہ کیا ہی اچھا ہو جو سیمل اس کی زندگی میں شامل ہو جائے تو اس کی ہمراہی میں دکھ کا بوجھ اٹھانا سہل ہو جائے گا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کتنی خاموشی اور ویرانی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں وہ گھر آیا تھا جہاں جب چھٹی پر وہ جاتا تو ایک دم بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ بہنیں، کزنز، پھوپھی بھائی، چچا زاد، ماموں زاد سب اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے اور یہ صرف اس کے لیے ہی نہیں تھا جو بھی گھر آتا چھٹی گزارنے یونہی اس بڑے حویلی نما گھر میں رونقیں اتر آتی تھیں جواب ملبے کا ڈھیر بنا اپنے مکینوں کو روتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی تو وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔

"کاش میں کوئی ایسا شہر بسا سکتا کہ جہاں ہم زندگی بغیر کسی خوف اور ڈر کے گزار سکتے۔" میراں اماں کمرے سے باہر آئیں تو وہ تخت پر ہاتھوں کا تکیہ بنائے لیٹا ہوا تھا۔

"ارے بچہ یہاں کیوں لیٹے ہو اتنی تپش میں؟" انہوں نے گھبرا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"یونہی اماں جان، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے ان کی کلائی تھام کر ان کی نبض دیکھی۔ "بخار تو نہیں ہے اب۔"

"ہاں، طبیعت ٹھیک لگ رہی ہے۔" وہ تخت پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ دھوپ اب دیواروں پر سے بھی غائب ہو گئی تھی۔ سورج غروب ہونے کی تیاریوں میں تھا لیکن فضا میں تپش اور حبس تھا۔ ہوا کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ نوشیرواں نے اٹھ کر برآمدے کا پنکھا آن کیا۔

"شیری بچہ......"

"جی اماں جان۔"

"شادی کر لے اب...... اپنا گھر ہوگا، بچے ہوں گے تو جینے کو جی چاہے گا۔ میں نہ رہی تو اکیلا ہو جائے گا بالکل۔"

"اللہ آپ کو بہت لمبی زندگی دے اماں جان۔"

"جو جوان تھے، بچے تھے جنہیں بہت زیادہ جینا تھا، جن کے ہاتھوں ہم نے اپنے آخری سفر پر جانا تھا وہ چلے گئے تو ہم کب تک رہیں گے، دل تیرے لیے بڑا پریشان ہوتا ہے۔ تجھے ہنستا بستا دیکھ لوں، بس یہی خواہش ہے جو بار بار دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ میری بات مان لے بچہ......"

"کوئی لڑکی ڈھونڈ رکھی ہے آپ نے تو بتا..."

"تو مان لے تو پھر لڑکی بھی ڈھونڈ لوں گی۔ دلدار کا چاچا ہے نا، ادھر وادی شوال میں چھ ماہ پہلے ادھر آیا تھا ملنے اپنی بیوی کے ساتھ، اس کی بیوی کہہ رہی تھی کہ تیرے بابا کے کوئی دوست ہیں ادھر۔ آرمی سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ کرنل تھے، ان کی بیٹی ہے بڑی اچھی، اگر تو کہے تو......" انہوں نے بڑی تفصیل سے

بات کی تھی۔ نوشیرواں یکدم چپ ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار کی طرف اٹھی تھیں اور میراں اماں جیسے اس کے دل کی بات جان گئی تھیں۔

"سیمل مجھے اچھی لگتی ہے، کئی دفعہ میں نے سوچا کہ سیمل کو تمہارے لیے مانگ لوں...... لیکن کس سے۔ نہ سیمل کا باپ نہ بھائی...... اور ماں کی یہ حالت...... اور اگر وہ ہوتے بھی تو شاید ہم اجنبی لوگوں کو وہ رشتہ نہ دیتے۔ یہاں تو برادری سے باہر کچھ لوگ رشتے نہیں دیتے...... اور ہم تو ہیں ہی دوسرے علاقے کے۔"

"ہمارے خاندان کے مردوں نے بھی تو پنجابیوں سے شادیاں کی تھیں اماں جان۔"

"وہ اور بات تھی بچے...... آرمی میں اکٹھے رہے، آرمی میں ہی شادیاں ہو گئیں...... اب ہم۔" وہ چپ ہو گئی تھیں ان کے چہرے پر ملال تھا جیسے سیمل کو نوشیرواں کے لیے نہ مانگنے کا دکھ ہو۔ نوشیرواں کھڑا ہو گیا۔

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی اماں جان جب تک کل نہیں مل جاتا۔"

"کل کب ملے گا تو جانتا ہے شیری...... بڈھا ہو جائے گا۔" نوشیرواں نے جواب نہیں دیا تھا۔ مغرب کی اذان شروع ہو گئی تھی۔

"آپ نماز پڑھ لیں تو میں آپ کے لیے چائے بنا دوں گا۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میراں اماں وہاں تخت پر بیٹھے اسے جاتا دیکھ رہی تھیں۔

"ماں سے بھی کبھی اولاد کے دل کا حال چھپتا ہے بچہ۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ چنگاری شعلہ بنے انہوں نے نوشیرواں کو زنجیر کرنے کا سوچا تھا۔ پہلے تھوڑے زخم لگے ہیں دل پر جو...... لیکن وہ نہیں جانتی تھیں چنگاری تو کب کی شعلہ بن چکی تھی اور یہ بات خود نوشیرواں کو بھی ابھی معلوم ہوئی تھی کہ سیمل اس کے لیے کتنی اہم ہو چکی ہے اور وہ سیمل کے علاوہ کسی اور کو زندگی میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ سیمل کو دل میں چھپا کر کسی اور کے ساتھ زندگی بسر کرنا اس کو دھوکا دینا ہے اور نوشیرواں عادل نے زندگی میں کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ جانماز بچھاتے ہوئے اس نے سوچا اور اس روز جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی دعاؤں میں ایک اور دعا کا اضافہ ہو چکا تھا۔ عمر بھر کے لیے سیمل کی رفاقت اور ساتھ کی دعا۔

☆☆☆

سیمل نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دعا مانگتے ہوئے وہ جھجک گئی۔ کتنے سالوں سے وہ ایک ہی دعا مانگتے جا رہی تھی۔ اماں کی صحت اور مروان کی واپسی کی دعا۔ کیا آخرت کے مسافر بھی کبھی پلٹ کر آ سکتے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ نہیں...... پھر یہ دعا مانگ کر اتنے سالوں سے خود کو کیوں دھوکا دے رہی تھی۔ وہ شرمندہ سی ہاتھ بلند کیے بیٹھی تھی تب بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"اے اللہ مروان کو مغفرت عطا فرما...... اس کے درجات بلند کر......" وہ دعا مانگ رہی تھی اور اس کے آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے۔

"یا اللہ...... ابا کا دل موم کر دے، ان کے دل سے اماں کے لیے نفرت ختم کر دے۔ یا اللہ انہیں میرے حق میں اور اماں کے حق میں ایسا کر دے جیسا کہ باپ اور شوہر ہونے کا حق ہے۔" آج پہلی بار وہ ابا کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ دعا مانگ کر اس نے ہاتھ چہرے پر پھیرے اور جانماز تہ کر کے رکھی پھر اماں کی طرف دیکھا جو ایک رسالہ کھولے بیٹھی تھیں۔ جب وہ میراں اماں کے گھر سے آئی تھی تب بھی ان

کے ہاتھ میں رسالہ تھا شاید انہوں نے اس کے بیڈ سے اٹھایا تھا اور اس وقت بھی انہوں نے وہ رسالہ اٹھایا ہوا تھا۔

''اماں جی مغرب کا وقت ہے۔'' اس نے انہیں متوجہ کرنے کے لیے کہا، انہوں نے فوراً رسالہ بند کر کے رکھ دیا تو وہ مسکرا دی۔ ''اماں جی باہر چلیں اندر گھٹن اور حبس ہے بہت۔ میں چائے بناتی ہوں آپ صحن میں بیٹھیں'' فضیلت نے جانے سے پہلے چھڑکاؤ کیا تھا۔ زمین تپ چکی تھی اور گرم ہو گئی تھی۔

اماں اٹھ کھڑی ہوئیں انہیں تخت پر بٹھا کر اس نے موتیے کی چند ادھ کھلی کلیاں توڑ کر اماں کو دیں تو وہ بالکل پہلے کی طرح انہیں کان میں ڈالنے لگیں۔ وہ چائے بنا کر لائی تو اماں کانوں میں موتیے کے پھول ڈالے بیٹھی تھیں۔ اس نے تخت کے سامنے چھوٹی سی ٹیبل رکھ کر چائے کا سامان اس پر رکھا اور برآمدے کی لائٹ جلائی پھر چائے پیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح ان سے باتیں کرنے لگی۔ مہران اماں کی، نوشیرواں کی، حمنہ کی اور یونیورسٹی کی' آج چائے پیتے ہوئے اماں نے بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سنیں اور جب وہ چائے کے برتن رکھ کر واپس آئی تو وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

''باہر مچھر آ گئے ہیں۔'' انہوں نے مڑ کر اسے بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے اماں، آپ جائیں میں کھانا بناتی ہوں۔ فضیلت نے صبح کر لے گوشت بنایا تھا لیکن میرا دل نہیں چاہ رہا اب کھانے کو، کھچڑی بنا لوں۔''

''ہاں بنا لو۔'' انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''اماں ٹھیک ہو رہی ہیں، وہ تبدیل ہو رہی ہیں۔ اس طرح کا ریسپانس تو ان آٹھ سالوں میں انہوں نے ایک بار بھی نہیں دیا تھا۔ ڈاکٹرز جو بھی کہیں ایک اور ہستی بھی تو ہے اوپر آسمانوں پر سب سے ماورا سب سے بلند چاہے تو مُردے کو زندہ کر دے چاہے تو آسمان الٹ دے، کیا وہ ہستی اماں کو ٹھیک نہیں کر سکتی بالکل پہلے جیسا۔۔۔ شاید میری دعا اللہ نے سن لی۔'' کھچڑی بناتے ہوئے اس نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

رات وہ بہت سکون سے سوئی تھی۔ یونیورسٹی بند ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ رات دیر سے سوئی تھی لیکن پھر بھی اس کی آنکھ فجر کے وقت کھل گئی تھی۔ اس نے دیکھا اماں جانماز پر بیٹھی تھیں اور ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ وہ بڑی خوشی سے آنکھیں نیم وا کیے انہیں دیکھتی رہی، جب وہ جانماز تہ کر رہی تھیں وہ اٹھ کر بیٹھ گئی وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی جب اماں جانماز اپنے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ کر اس کی طرف مڑیں اور انہوں نے بہت پہلے کی طرح اس کے قریب آ کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پھونک ماری اور پھر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے بے اختیار ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیے اور پھر انہیں آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے تو اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ واش روم چلی گئی۔ وہ یقیناً اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے جب وہ صدقِ دل سے اسے پکاریں۔ اس نے مشیتِ ایزدی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ مروان اب نہیں رہا اور وہ جو دنیا میں آتا ہے اسے ایک روز جانا بھی ہوتا ہے تو اللہ نے بھی اس کے لیے درِ قبولیت کھول دیا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کل جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے تو وہ کوئی قبولیت کا لمحہ تھا اور اس کی دعائیں مستجاب ہو گئی تھیں۔ وہ سرشاری ناشتا بناتی رہی۔ جب اماں باہر تخت پر بیٹھی ناشتا کر رہی تھیں تو وہ بار بار انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھیں لیکن جب وہ نگاہ اٹھا کر سیمل کی طرف دیکھتی تھیں تو ان کی نگاہوں میں وہ خالی پن نہیں ہوتا تھا۔ آج فضیلت نے دیر سے آنا تھا۔ وہ گھر پر ہی تھی اس لیے اس نے خوشی خوشی اسے اجازت دے دی تھی۔

آج موسم اچھا تھا آسمان پر بادل تھے اور فضا میں مٹی کی مہک تھی جیسے رات کہیں بارش ہوئی ہو۔ دھوپ ابھی ان کے صحن میں نہیں آئی تھی۔ وہ ناشتے کے خالی برتن سنک میں رکھ کر اپنی کتابیں اٹھا کر باہر ہی آ گئی۔ کتابوں کا ڈھیر اس نے تخت پر رکھا اور خود کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

''اماں میں ماسٹر کر کے پھر پبلک سروس کمیشن کی تیاری کروں گی۔ اور جاب کروں گی۔'' ضروری پوائنٹس کو مارک کرتے ہوئے اس نے اماں سے کہا۔ اماں اس کی کوئی کتاب کھولے یونہی اس کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی وہ اپنے نوٹس بنانے میں مگن تھی کہ اماں نے اسے بلایا۔

''گڑیا۔۔۔'' اس نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ کتاب ابھی بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔

''جی اماں جی۔''

''بیٹا وہ روی۔۔۔'' وہ ابھی ابھی ہی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ''روی کہاں ہے، وہ اتنے دنوں سے گھر کیوں نہیں آیا؟''

''اماں جی۔'' اس کی آواز اس کے حلق میں ہی پھنس گئی تھی۔ ''اماں جی وہ روی بھائی۔۔۔'' اس نے بتانے کی کوشش کی تب ہی دروازے کی بیل بجی، مسلسل جیسے کوئی بیل پر ہاتھ رکھ کر اٹھانا ہی بھول گیا ہو۔

''اوہو، یہ فضیلت بھی بس۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، مڑ کر اماں کی طرف دیکھا اور برآمدے سے صحن میں آ گئی اور دروازہ کھولا۔

''تم بھی نا فضیلت۔۔۔'' اور پھر لفظ اس کے ہونٹوں میں ہی رہ گئے۔ وہ باہر کھڑی ہستی کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک دم پلٹ کر بھاگی۔

''سنو۔۔۔ سنو گڑیا۔'' حبیب خان نے اندر قدم رکھا اور اسے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے چلے آئے تھے۔

''نہیں۔۔۔'' اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

''اماں۔۔۔ وہ۔۔۔ ابا۔۔۔'' اماں یکدم کھڑی ہو گئی تھیں اور انہوں نے اسے اپنے پیچھے چھپا لیا تھا اور وہ ان کے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''گڑیا بیٹا ڈرو نہیں، کیوں ڈر رہی ہو مجھ سے۔۔۔'' وہ صحن عبور کر کے برآمدے میں قدم رکھ چکے تھے۔

اماں حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اپنے دونوں بازو پیچھے کیے وہ سیمل کے گرد لپیٹے ہوئے تھیں اور سیمل ان کی پشت سے چپکی ہوئی تھی۔

''یا اللہ مہران اماں اوپر سے جھانک لیں اور نوشیرواں آ کر مجھے ابا سے بچا لے۔'' اس کے دل سے دعا نکلی۔ آج اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ مروان کہیں سے آ کر اسے ابا سے بچا لے۔ آج اس نے نوشیرواں کو سوچا تھا۔ وہ خود ہی حیران ہوئی تھی۔

''کہاں چھپ گئے تھے تم لوگ' میں کب سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔ کہاں، کہاں نہیں میں نے تم لوگوں کو تلاش کیا۔'' ان کی آواز میں لرزش تھی۔

''جب ان وکیل صاحب کا خیال آیا جو تم لوگوں کے معاملات کی نگرانی کرتے تھے تو وہ ملک سے باہر جا چکے تھے۔ کتنے چکر لگائے تھے ان کے دفتر کے۔۔۔ ایک بار گیا تو دفتر کو تالا لگا ہوا تھا۔ پتا چلا اسلام آباد شفٹ ہو گئے ہیں۔ کہاں۔۔۔ کس جگہ کوئی فون نمبر کچھ نہ معلوم ہو سکا۔''

گڑیا نے اماں کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ اسے لگا تھا جیسے وہ رو رہے ہوں لیکن وہ تو اسے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سر فوراً پیچھے کر لیا۔

"کتنا تڑپا ہوں میں تمہارے لیے۔۔۔ اس دن کے بعد دوبارہ تم نظر نہ آئیں۔ گویا غائب ہی ہو گئیں، میں ہفتوں اس جگہ پر جاتا رہا۔ گاڑی پارک کر کے گلیوں میں چکراتا پھرتا کہ شاید تم نظر آ جاؤ۔"

یہ وہ ابا تو نہ تھے۔۔۔ جنہیں بسمل جانتی تھی۔ اتنی نرمی سے، اتنی عاجزی سے بات کرنے والے۔۔۔ ابا کی آواز کی گرج سے تو جیسے گھر ہل جایا کرتا تھا لیکن آج۔۔۔

اماں ابھی تک حیران کھڑی تھیں اور ان کے بازو بسمل کے گرد سے ہٹ کر ان کے پہلوؤں میں آ گرے تھے۔

"بیٹا۔۔۔ بیٹا مجھے معاف کر دو۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ بسمل اب اماں کے پیچھے سے نکل کر ان کے قریب کھڑی حیرت سے ابا کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے اماں کو ان کے نام سے بلایا تھا۔ وہ پہلی بار ان کے لبوں سے اماں کا نام سن رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ابا کی آواز گونج رہی تھی۔

"احمق عورت۔۔۔ جاہل عورت۔۔۔ یہ عورت۔۔۔" اور مروان ان کے اس طرز تخاطب سے کتنا چڑتا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو اس وقت کتنا خوش ہوتا۔ کتنی حسرت تھی اسے کہ ابا بھی احترام سے عزت سے اماں کا نام لیں۔۔۔۔ عزت، احترام سے نہ سہی یونہی بس نام لے کر بلا لیں۔

"کاش۔۔۔ اے کاش روی ہوتا اس وقت۔۔۔" اپنی پلکوں کو جھپک کر اس نے ابا کو دیکھا۔

"میں نے تمہیں بہت ستایا بیٹا۔۔۔ بہت گنہگار ہوں تمہارا۔۔۔ اور ان شریف اور نیک لوگوں کا جنہوں نے مجھے، مجھ گندی نالی کے بے نام و نشان شخص کو اپنا نام دیا، پستی سے اٹھا کر بلندی تک پہنچایا، مجھے محبت دی، تحفظ دیا، زندگی کی ہر آسائش دی اور وہ سب کچھ دیا جس کی خواہش کوئی بھی شخص کر سکتا ہے اور میں نے سوائے اذیت کے انہیں کچھ نہیں دیا۔ ابا نے جن نظروں سے آخری بار مجھے دیکھا تھا ناں۔۔۔ ان نظروں کا دکھ میرے دل میں تڑ گیا ہے بیٹا۔" آنسو ان کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ ابا رو رہے تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ رلایا تھا اسے۔۔۔ اماں کو۔۔۔ روی کو۔

"میں راتوں کو سو نہیں پاتا ہوں بیٹا۔۔۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو ابا میرے تصور میں چلے آتے ہیں۔ اماں کی وفات پر میں نے انہیں اکیلا وہاں چھوڑ دیا تھا۔۔۔ کتنی بے دردی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔" ابا بول رہے تھے اور وہ اماں کے بازو سے لگی اب بھی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا۔" انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے پھر یکدم ان کے پاؤں کی طرف جھکے۔ "میں تمہارے پاؤں پکڑتا ہوں بیٹا۔۔۔" اماں یکدم پیچھے ہٹی تھیں۔

ابا ملتجی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

اماں پیچھے ہٹتے ہٹتے تخت سے جا لگیں۔

"بہت زیادہ ناراض ہو مجھ سے بیٹا۔ ایک بار مجھے معاف کر دو۔" بسمل اماں کو دیکھ رہی تھی جو ساکت سی تخت کے ساتھ کھڑی سامنے ابا کو دیکھ رہی تھیں۔

"پتا نہیں اماں، ابا کو پہچان بھی رہی ہیں۔ معلوم نہیں وہ ابا کی بات کو سمجھ بھی رہی ہیں۔" بسمل نے اماں کو دیکھا اور پھر ابا کو یہ بتانے کے لیے منہ کھولا کہ اماں ٹھیک نہیں ہیں اور یہ کہ اماں کی یہ حالت برسوں سے ہے لیکن اماں نے اسے حیران کر دیا، وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔

"میں تو کبھی آپ سے ناراض نہیں ہوئی تھی۔ بس آپ پر ترس آتا تھا مجھے تو ڈر لگتا تھا کہ آپ کی یہ خود پرستی آپ کو نقصان نہ پہنچا دے۔" وہ آنکھیں پھاڑے اماں کو اتنا زیادہ بولتے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں نقصان تو اتنا بڑا ہو گیا کہ کبھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔۔۔ اللہ نے مجھے سبق سکھانے کے لیے میرا بیٹا مجھ سے لے لیا اور اس پیچ کچ کی جاہل عورت کو مجھ پر مسلط کر دیا۔"

"کون بیٹا؟" اماں کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھیں، ان کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ ابا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ہمارا بیٹا۔۔۔ روی۔۔۔ ہمارا مروان۔ اماں، ابا کا لاڈلا شہزادہ۔۔۔ اماں، ابا کو کتنا پیار تھا اس سے اور میں نے کتنا ترسایا انہیں۔ وہ فون کرتے میں روی سے بات نہ کرواتا۔ وہ اسے بلاتے میں نہ بھیجتا۔۔۔ اور اب میں خود اس کے لیے ترس رہا ہوں۔ پورے گھر میں اوپر نیچے پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پکارتا ہوں لیکن وہ کہیں نہیں نظر آتا بیٹا۔۔۔ کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ ایک دفعہ مجھے نظر آ جائے۔۔۔ بھلے مجھ سے جھگڑے، ناراض ہو۔ میں ایک بار اسے سینے سے لگا کر اس کے جوان جسم کی حرارت سے خود کو مضبوط سمجھوں۔ بس ایک بار بیٹا۔۔۔ لیکن وہ نہیں ہے، وہ کہیں نہیں ہے۔۔۔ ابا نے بھی تو آخری بار فون کیا تھا۔ ایک بار۔۔۔ آخری بار حبیب خان مجھے روی سے ملوا دو اور خود بھی مل جاؤ۔" وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

"ابا جی۔۔۔" بسمل تڑپ کر اماں کے قریب سے ان کی طرف بڑھی تو انہوں نے اپنے بازو وا کر دیے اور وہ مروان کے جانے کے آٹھ سالوں بعد ابا کے سینے سے لگی رو رہی تھی، بلک رہی تھی۔ "ابا جی! روی بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔" وہ روی کے لیے سیکڑوں بار روئی تھی اکیلے تنہا یا ممّا کے گلے لگ کر لیکن ابا کے گلے لگ کر وہ پہلی بار رو رہی تھی۔ ابا بھی رو رہے تھے۔ اماں بھی رو رہی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں وحشت تھی پھر ابا ہولے ہولے اسے تھپکنے لگے۔

"حوصلہ کرو چندا، گڑیا بیٹا بس کرو اب، اللہ کی امانت تھی۔۔۔ اس نے اپنی امانت لے لی۔ اللہ نے اسے سرخرو کیا۔ ایسی موت جس کی تمنا سب کریں۔" پہلی بار مروان کی موت کے بعد بسمل کو لگا تھا جیسے اس کے دل پر کسی نے مرہم رکھا ہو۔ ابا سے الگ ہو کر اس نے اماں کی طرف دیکھا۔ وہ سہمی سہمی سی کھڑی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"اماں۔۔۔" وہ ان سے لپٹ گئی اور اب وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے رو رہی تھیں۔ جیسے آج ابھی روی کی شہادت کی اطلاع آئی ہو۔ بہت دیر بعد جب وہ تینوں سنبھلے تو بسمل بھاگ کر کرسی اٹھا لائی۔ اماں تخت پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو گود میں دھرے دیکھ رہی تھیں اور بسمل اماں سے جڑی بیٹھی ابا سے ان آٹھ سالوں کی روداد سن رہی تھی۔

"میرے پیارے زہن نے مجھے نازو سے شادی پر اس لیے اکسایا تھا کہ میں تمہیں اور روی کو اذیت دے سکوں۔ میں کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی کرتا تو شاید تمہیں اتنی اذیت نہیں ہوتی جتنی نازو سے شادی پر تمہیں اور روی کو اذیت ہوئی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی بیٹا کہ روی مجھے تہی دامن کر کے چلا جائے گا۔ جب مجھے فون آیا کہ میں اپنے بیٹے کی ڈیڈ باڈی وصول کر لوں تو ایک لمحے کو تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ آخر روی کی ڈیڈ باڈی مجھے کیوں وصول کرنے کو کہا جا رہا ہے پھر مجھے ادراک ہوا کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ وہ اذیت جو میں روی کو دینا چاہتا تھا اس سے کئی گنا زیادہ اذیت

وہ مجھے دے کر چلا گیا تھا۔ میں روحی کے لیے تڑپتا تھا تو نازو مجھے تڑپنے نہیں دیتی تھی۔ روحی میرا بیٹا تھا وہ جب پیدا ہوا تھا تو میں نے اس کی پیدائش پر فخر محسوس کیا تھا۔ جس کی کامیابیوں پر میں دل میں مسرور ہوتا اور فخر محسوس کرتا تھا گو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ وہ اس بیٹے کی دائمی جدائی پر مجھے رونے نہیں دیتی تھی، وہ مجھے روحی کو گڑیا کو اور تمہیں یاد کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ میں تمہیں اور گڑیا کو گھر لانے کی بات کرتا تو وہ فساد کھڑا کر دیتی۔ اس لیے روحی کی شہادت کے چھ ماہ بعد ہی میں نے اسے طلاق دے دی۔ بس میرا ایک ہی کام رہ گیا تھا تمہیں ڈھونڈنا ــــ میں آفس سے اٹھتا اور سڑکوں پر گلیوں میں پھرا تا پھرتا کہ شاید کہیں کسی جگہ پر تم نظر آجاؤ۔۔۔۔۔ کل رات وکیل صاحب اچانک مجھے نظر آگئے وہ اپنے کسی کیس کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے رات کیسے گزاری، بتا نہیں سکتا۔۔۔۔ میں تو منہ اندھیرے ہی سڑک پر آکھڑا ہوا اور انتظار کرتا رہا کہ سورج نکلے تو دروازے پر دستک دوں۔" وہ پھر رونے لگے تھے۔ اماں ایسے ہی بیٹھی تھیں چپ اور گود میں رکھے ہاتھوں کے ناخنوں میں جانے کیا تلاش کرتی رہیں۔ بسمل نے اماں اور ابا دونوں کو پانی پلایا۔

"تمہاری اماں میری طرف دیکھتی نہیں، بسمل گڑیا مجھ سے بات نہیں کرتیں ان سے میری سفارش کرو بیٹا ایک بار دل سے مجھے معاف کر دیں۔ مجھے تلافی کا موقع دے دیں۔" تب بسمل نے روتے ہوئے انہیں اماں کے متعلق بتایا تھا اور ان کا سر جھک گیا۔۔۔۔ وہ بے حد نادم ہو کر بسمل سے معافی مانگنے لگے۔

"اس طرح کی باتیں نہ کریں ابا جی۔" بسمل اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں ناشتا بناتی ہوں۔"

"نہیں، تم دونوں ابھی چلو میرے ساتھ۔" وہ بچلے تھے۔

"ابھی؟" بسمل پریشان ہوگئی۔

"ابھی کیسے ابا جی؟ یہاں برسوں رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا، ہمارے ہر دکھ سکھ میں شریک۔۔۔۔۔ ورنہ روحی کے بعد میں اور اماں بہت اکیلے تھے، اماں بیمار، حواس سے بیگانہ اور میں اکیلی ــــ میں ان سب سے مل کر انہیں بتا کر ہی جا سکتی ہوں ــــ ایک دم سے ایسے کیسے، مجھے تو ابھی کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا ــــ یہ سب کیا ہے۔ آپ کی آمد کی ۔۔۔ بتاؤں ابا جی مجھے یقین نہیں آرہا کہ ــــ"

"ٹھیک ہے جب تمہیں یقین آجائے تو جب چلیں گے۔" حبیب خان بہت محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"لیکن میں اب ایک دن کی بھی دوری برداشت نہیں کرسکتا۔ میں بھی یہاں ہی رہوں گا۔ تمہارے پاس جب تک تم یہاں ہو۔" وہ آہستہ سے بولے۔

"بیٹا مجھے ٹالو گی تو نہیں ـــ؟" وہ لگاوٹ سے اماں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ناشتا بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ وہ ابا کی اس طرح اچانک آمد پر ابھی تک حیران تھی۔

"اور کیا پتا ابا نازو کے کہنے پر یہاں آئے ہوں اور ہمیں لے جا کر وہ لیکن نہیں ـــ" اس نے خود ہی اپنے خیالات کی نفی کر دی۔ "یہ سب ڈراما نہیں ہوسکتا اور ابا کو بھلا یہ ناٹک کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ چاہتے تو زبردستی بھی ساتھ لے جا سکتے تھے اور انہیں کون ایسا کرنے سے روک سکتا تھا بھلا۔" ناشتے کے بعد وہ اماں کو کمرے میں لے آئی تھی، ایک بار پھر انہوں نے چپ کی چادر اوڑھ لی۔ ابا نے اماں کی فائل دیکھی۔

"میں ڈاکٹر عرفان سے مل کر ان کی کنڈیشن معلوم کرتا ہوں۔"

"میں تو اماں کی آواز سننے کو ترس گئی تھی ابا جی، جو انہوں نے ذرا ذرا سا بولنا شروع کیا ہے تو صرف چند ماہ سے ورنہ تو ـــ"

"فکر نہ کرو، میں انہیں بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا بیٹا ـــ اگر باہر جانا پڑا تو باہر لے جاؤں گا۔" وہ کہہ رہے تھے اور بسمل کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اماں کو میڈیسن دے کر اس نے ابا کی طرف دیکھا۔

"ابا جی آپ ادھر لیٹ جائیں، رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں کچھ دیر آرام کر لیں۔" اپنے بیڈ کی طرف اشارہ کر کے اس نے تڑے مڑے تکیے کھینچے تھے۔ وہ اور روحی یونہی سنبل کے تکیوں کو توڑ مروڑ کر سر کے نیچے رکھتے تھے۔

"فضیلت آئی ہوگی، میں ذرا کچن میں سمیٹ لوں۔" جب وہ کچن سمیٹ کر آئی تو ابا بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے گود میں تکیہ دھرے بیٹھے تھے۔ تکیے پر کہنیاں رکھے دائیں ہاتھ کے پیالے میں تھوڑی رکھے وہ بڑے انہماک سے اماں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کی آنکھیں لیے بعد لو دیتی لگتی تھیں ـــ بسمل دروازے کے ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ کر ابا کو دیکھنے لگی ـــ یہ لو دیتی خوب صورت آنکھیں روحی کی آنکھوں سے ملتی تھیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ابا بے حد خوب صورت تھے لیکن آج سے پہلے وہ اسے کبھی خوب صورت نہیں لگے تھے بلکہ جب وہ چھوٹی تھی تو سوچتی تھی کہ اگر ابا کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ لگا دیے جائیں اور ان کے دو دانت باہر نکل آئیں تو وہ بالکل سامری جادوگر یا زکوٹا جن نہیں ـــ یا پھر کوئی دیو، اس بات نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ اس نے فوراً ہی ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبائی لیکن ابا کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ تو جانے ماضی کے کون کون سے ورق کھولے بیٹھے تھے۔

"تمہیں یاد ہے بیٹا جب میں باہر جا رہا تھا تو تم بڑے کمرے کی سلاخوں والی کھڑکی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے صحن میں کھڑے کھڑے اماں، ابا سے مل کر یونہی نظریں اٹھائی تھیں تو تم پر نظر پڑی تھی تم فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی تھیں لیکن میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ دیکھ لی تھی اور حیران ہوا تھا کہ تم رو کیوں رہی ہو۔۔۔۔ اور اس پر بھی حیران ہوا تھا کہ تم اماں، ابا اور پھپو کے ساتھ حویلی کے گیٹ تک مجھے خدا حافظ کہنے نہ آئیں بلکہ برآمدے سے ہی واپس چلی گئی تھیں۔ شاید تم مجھ سے اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھیں یا پھر شاید تم مجھے بہت دھیان سے سب سے چھپ کر دیکھنا چاہتی تھیں۔ تب تم اتنی بڑی بھی تو نہیں تھیں نا ـــ شاید آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھیں اور جب میں واپس آیا تھا تو ایک لمحے کو تو میں تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ارے یہ حنو ہے ـــ اتنی ملاحت، اتنا حُسن میں تو مبہوت سا تمہیں دیکھے ہی جاتا اگر ابا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ناصرہ خالہ سے نہ ملواتے۔"

"یہ ناصرہ ہے تمہاری اماں کی خالہ زاد بہن، تم کو تو بالکل یاد نہیں ہوگا ـــ جب تم چھوٹے سے تھے تو یہ کراچی چلی گئی تھیں اب ان کے میاں اچھی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں تو یہ واپس گاؤں آگئی ہیں۔" اس وقت مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ ناصرہ خالہ میری زندگی میں کیا زہر گھولنے والی ہیں۔ میں نے تمہیں پھر دیکھا تھا، تم چپکے چپکے مجھے دیکھتی تھیں اور جب میں تمہاری طرف دیکھتا تو تم فوراً نظریں جھکا لیتیں اور مجھے تمہاری اس چوری پر ہنسی آجاتی جسے میں سر جھکا کر چھپا لیتا تھا۔" اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی تھیں۔ ان کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ ذرا سی پلکیں اٹھا کر ابا کو

تھیں اور کبھی یکدم ساکت نظروں سے ابا کو دیکھنے لگتیں۔ بیسل چپکے سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ کچھ دیر وہ برآمدے میں کھڑی رہی پھر فضیلت کو بتا کر صحن میں آ کر دیوار پر سے دوسری طرف کود گئی۔ میراں اماں اپنے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ابھی تک قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ قرآن کو جزدان میں لپیٹا۔

"آؤ، آؤ بیسل بچہ..... آج اتنی سویرے کیسے آ گئیں؟"

"اماں جان۔" بیسل خوشی سے ان کے گلے لگ گئی۔

"ابا آئے ہیں صبح صبح....." وہ انہیں تفصیل بتانے لگی۔

"وہ ہمیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں گھر..... گر میں....."

"نہ بچہ ضرور جاؤ اپنے ابا کے ساتھ۔ اللہ نے ان کا دل پھیرا ہے، شکر کرو بیسل بچہ اپنے رب کا۔ بغیر سائبان عورت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے چوراہے پر پڑی چیز..... جس کا جو جی چاہے سلوک کرے۔ عورت تو اپنے سائبان سے ہی معتبر ہوتی ہے بیسل بچہ، باپ، بھائی، شوہر، بیٹا کوئی تو ہو۔ اکیلی عورت تو چار دیواری میں بھی غیر محفوظ ہوتی ہے۔ تمہاری اماں کی یہ حالت..... شکر اللہ کا لوگ اچھے ہیں آس پاس کے، مروت لحاظ والے، خیال رکھتے ہیں تم دونوں کا پر بیٹا نیت بدلنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ یہ تو حاجی صاحب تمہاری حسنہ کے ابا کا رعب داب ہے کہ کوئی آنکھ اٹھا کر تمہارے گھر کی طرف نہیں دیکھتا پر کب تک بچہ..... اکیلی عورت پر تو جھپٹنے کے لیے گدھوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے ہوتے ہیں دنیا والے۔ اللہ کا نام لے کر ابا کے ساتھ سدھارو۔"

"جی اماں جان۔" بیسل کے دل میں اگر کوئی الجھن تھی تو میراں اماں کی باتوں سے دور ہو گئی تھی۔

"ابا بہت بدل گئے ہیں۔ مروان کی موت نے انہیں اندر سے توڑ دیا ہے۔" جزدان میں لپٹے قرآن شریف کو گود سے اٹھا کر میراں اماں اٹھیں۔

"بیٹھو بچہ، میں یہ قرآن رکھ آؤں تو تیرے لیے چائے بناتی ہوں۔"

"نہیں، اماں جان میں تو چائے پی کر آئی ہوں۔ آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی؟"

"ہاں، آج شیری صبح صبح ہی چلا گیا۔"

"کہاں.....؟" بیسل کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"یہی اسلام آباد، پنڈی تک گیا ہے۔"

"اچھا۔" بیسل کے اندر مایوسی سی پھیل گئی۔

"کب تک واپس آئیں گے؟"

"بتا کر تو نہیں گیا..... ایک دو روز تک آ جائے گا۔" میراں اماں نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر قرآن لے کر کمرے میں چلی گئیں اور جب کمرے سے نکلیں تو بیسل کچن میں کھڑی تھی۔ کچن کے دروازے سے جھانک کر اس نے میراں اماں کو دیکھا۔

"اماں جان، آپ بیٹھیں میں چائے بناتی ہوں اور ناشتے میں کیا لیں گی، پراٹھا بنا دوں؟"

"نہ، نہ بیسل بچہ بس چائے کے ساتھ رس دے دینا..... اُدھر کا ڈبہ پڑا ہے۔" وہ تخت پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"کاش یہ اتنی اچھی، اتنی پیاری لڑکی شیری کا مقدر بن سکتی لیکن اتنے امیر باپ کی بیٹی اور کہاں ہم خانماں برباد..... اللہ میرے شیری کے دل سے اس کا خیال نکال دے۔ ایسا لٹا پٹا..... ایسا زخمی دل..... ایک اور زخم کھانے کی کہاں گنجائش ہے اس کے دل میں میرے مولا۔ ماں، باپ، بہن، بھائی پہلے ہی سارے رشتے لٹ کر بیٹھا ہے میرا بیٹا۔ اب ایک اور رشتے کا درد اسے نہ دینا مولا۔" وہ دل ہی دل میں اللہ سے باتیں کیے گئیں، دعائیں کیں اور پھر نم آنکھوں کو پونچھا۔ جب بیسل ٹرے میں ناشتا لگائے آ گئی۔ ان کے منع کرنے کے باوجود اس نے ڈبل روٹی سینک لی تھی اور انڈا بھی فرائی کر لیا تھا۔

"منع کیا تھا بیسل بچے۔" نم آنکھیں پونچھ کر انہوں نے ٹرے کی طرف دیکھا..... "اور جو میری بیٹی ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ بڑے ناشتا بناتی تھی کہ اماں جان ناشتا ضروری ہے۔ وہ ہنستی..... اور ہنسنے میں اس کے ڈمپل کتنے نمایاں ہو جاتے تھے۔" ایک ٹھنڈی سانس لے کر انہوں نے سلائس اٹھا لیا تھا۔

"اپنے لیے بھی چائے بنا لیتی بچے۔"

"نہیں اماں جان، ابھی تو پی کر آئی ہوں۔"

میراں اماں کو ناشتا کرتے چھوڑ کر وہ دیوار..... پھلانگ کر گھر آ گئی۔ فضیلت صحن دھو رہی تھی۔ وہ شلوار کے پائنچوں کو بھیگنے سے بچاتے ہوئے کمرے میں آ گئی تو ابا اسی طرح تکیہ گود میں رکھے بیٹھے تھے۔ اور اماں بولتی وقفے وقفے سے مسکرا رہی تھیں۔

"پتا ہے بیٹا یہ عاصمہ خالہ تھیں جنہوں نے میرے دماغ میں یہ خناس بھرا تھا کہ تم میرے قابل نہیں ہو۔ میں جب بھی ان کی طرف جاتا وہ کہتی تھیں۔ تمہارے ساتھ بھائی صاحب اور آپا نے ظلم کیا..... کہاں تم اور کہاں مینا۔ وہ تو تمہارے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ تمہارے لیے تو کوئی بہت پڑھی لکھی اور خوب صورت ماڈرن لڑکی ہونی چاہیے تھی اور میرے اندر ان کی باتوں سے جو حس جاگ اٹھی تھی انا کا غبارہ پھولتا جا رہا تھا اور وہ اتنا پھولا کہ عاصمہ خالہ کی بیٹیاں بھی مجھے اپنے سے کمتر لگنے لگیں۔ وہ انگریزی تو تھیں۔ لیکن خوب صورت نہیں تھیں۔"

"ابا اور اماں امینہ کو میرے ساتھ بیاہ کر اس احسان کا بدلہ لے رہے ہیں جو انہوں نے مجھے پال پوس کر کیا تھا۔ یہ مجھ سے عاصمہ خالہ نے کہا تھا۔"

"ابا جی.....!" بیسل نے انہیں چونکایا تھا۔

"دوپہر کے لیے کیا پکواؤں؟"

"میری بیٹی جو پکائے گی میں وہی کھاؤں گا۔"

"بیٹی کے ہاتھ کا پکا کھا کر تو آپ دوبارہ اس کھانے کا نام بھی نہیں لیں گے۔" یہ اماں بولی تھیں۔ بیسل بے اختیار ہنسی تھی۔ کتنے سالوں بعد وہ اس طرح ہنسی تھی۔ وہ یکدم اپنی ہنسی سے خوفزدہ ہو گئی اور اس نے لب بھینچ لیے۔ مروان کہتا تھا۔

"ہنسا کرو گڑیا..... تم ہنستی کیوں نہیں ہو۔ خوش رہا کرو، تم خوش کیوں نہیں ہوتی ہو۔" اور وہ اسے ہنسانے کے لیے کیسے کیسے لطیفے سناتا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔

"بھئی ہماری بیٹی جیسا بھی پکائے گی کھانا ہم شوق سے کھائیں گے۔" ابا اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"دراصل ابا میں ابھی کھانا وانا نہیں بناتی۔ فضیلت ہی کرتی ہے سب..... اور اگر کبھی کوشش کروں تو وہ فضیلت سے بھی زیادہ خراب بنتا ہے۔ فضیلت بھی کوئی ماہر کک نہیں ہے لیکن گزارہ ہو جاتا ہے سو آج آپ بھی گزارہ ہی کریں۔"

"مینا کے ہاتھوں میں تو بہت ذائقہ تھا۔" بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"میں جب اماں سے سیکھ کر پکاؤں گی تو میرے ہاتھ میں بھی اماں جیسا ذائقہ ہو گا لیکن ابھی میں ذرا اپنا امتحان دے لوں۔"

"ابھی تم پڑھ رہی ہو؟" ابا نے شاید دل ہی دل میں حساب لگایا تھا۔

"ہاں، دراصل روی بھائی کے بعد میں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔" وہ اماں کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اور ابا کو روی کے اس طرح اچانک چلے جانے کے بعد اپنی کیفیات بتانے لگی۔ اب ایک بار پھر وہ رو رہی تھی اور ابا اسے اپنے ساتھ لپٹائے اسے حوصلہ دے رہے تھے اور اماں ساکت بیٹھی خالی دیواروں کو تکتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے والی مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ آنکھیں ویران اور خالی تھیں۔ اس نے ابا سے الگ ہو کر اماں کو لٹا دیا۔

"اماں دراصل میڈیسن کھانے کے بعد سو جاتی ہیں لیکن آج۔" اس نے ابا کی طرف دیکھا اور اماں کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے ان کا سر دبانے لگی۔ اماں کسی سعادت مند بچے کی طرح آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں اور ابا حسرت سے اسے اماں کا سر دباتے دیکھ رہے تھے۔ فضیلت کے طفیل آس پاس سب کو ہی ابا کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔ ابا ناشتے کے بعد کچھ دیر کے لیے باہر چلے گئے اور دن بھر پاس پڑوس کے گھروں سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ سب نے ہی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ حنہ بہت اداس تھی اور ابا کے آنے تک اس کے آس پاس ہی رہی تھی۔ وہ خود بہت اداس ہو رہی تھی۔ اتنے سارے سال اس نے یہاں گزارے تھے ان لوگوں کی محبتوں اور خلوص کے سہارے..... ابا واپس آئے تو ساتھ دو ملازم تھے۔ انہوں نے سب سامان پیک کر دیا تھا۔ اماں پھر سے چپ تھیں۔ بالکل خاموش جیسے کچھ سوچتی ہوں۔

"اماں جی، ابا ہمیں لینے آئے ہیں چلیں ان کے ساتھ۔"

"روی..... اس سے پوچھو ناں، ناراض ہوگا؟" بہت دیر بعد اماں بولی تھیں۔

"نہیں اماں جی، روی ناراض نہیں ہوگا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر ابا کبھی بلائیں تو چلے جانا۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں جل تھل ہو گئی تھیں۔

"اچھا!" اماں نے بس اتنا ہی کہا اور ان کی آنکھوں سے وہی خالی پن جھانکنے لگا۔

"کیا اماں اب بھی ٹھیک نہیں ہوں گی۔ کیا دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت ہمیشہ رہے گی۔" وہ افسردہ سی ہو کر باہر آ گئی۔ ابا باہر صحن میں کھڑے اپنے موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ بات کر کے انہوں نے سیمل کی طرف دیکھا۔

"تو کل صبح پھر چلیں۔"

سیمل نے سر ہلا دیا تھا۔

"تم خوش نہیں ہو سیمل..... تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر پوچھ رہے تھے۔

"نہیں، مجھے روی بھائی یاد آ رہے ہیں۔ ا[illegible] یہاں صحن میں چارپائی بچھا کر لیٹنا اور آسمان پر تاروں کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ کہتے تھے وہاں دادا کے گھر کے صحن سے بھی آسمان یونہی نظر آتا تھا۔"

"ہاں، ابا کے گھر میں مجھے بھی صحن میں لیٹ کر تاروں بھرا آسمان دیکھنا اچھا لگتا تھا۔" ابا یکدم [illegible] بہت اداس ہو گئے تھے۔

"جس صبح روی بھائی کو جانا تھا ہم دیر تک باہر روڈ پر ٹہلتے رہے تھے اور ہم نے کافی ہاؤس میں جا کر کافی بھی پی تھی۔"

"اچھا، چلو ہم بھی چلیں سیمل آج وہاں جہاں جہاں اس نے قدم رکھے تھے۔ وہاں ہی جا کر [illegible] تک جہاں اس نے کافی پی تھی۔"

"جی ابا اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو ضرور۔"

"ہاں میرا دل چاہتا ہے میں ان رستوں کو دیکھوں، ان جگہوں کو دیکھوں جنہوں نے آخری بار میرے بیٹے کے قدموں کو چھوا تھا۔" پھر کھانا کھا کر اماں اور ابا تینوں باہر نکلے تھے۔ آس پاس کی [illegible]

اور بچے حسب عادت پارک میں جا رہے تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے روڈ کراس کر کے کافی ہاؤس میں آ پہنچے۔ سیمل کو مروان بے طرح یاد آیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اور مروان سڑک کے کنارے کھڑے ہوں۔ ٹھنڈی یخ ہوائیں ان کے بدن کو چیرتی ہوں اور سینے کے اندر ایک جیسی ہوا اور——

"سیمل——" ابا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"جی ابا جی۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ انہوں نے بے اختیاری اس کا ہاتھ تھام کر دبایا تھا۔ کافی پینے کو اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا اور شاید ابا کا بھی پھر وہ وہاں سے واپس پلٹ آئے تھے۔ جب وہ اپنی گلی کی طرف مڑے تو اسے گمان گزرا کہ جیسے نوشیرواں گلی کے کونے سے بیکری والی گلی کی طرف مڑا ہو۔ اسے انجانی سی خوشی ہوئی تھی تو نوشیرواں واپس آ گیا تھا۔ وہ اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ نوشیرواں نے بہت بار ان کی مدد کی تھی۔ وہ جانے سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی لیکن وہ جو کل سے بے چین سی تھی اسے یکدم قرار آ گیا تھا۔ گھر آ کر اماں کو دوائیاں دے کر وہ بڑے سکون سے اماں کے بیڈ کے پاس میٹرس بچھا کر سو گئی تھی۔

ابا، اماں سے پرانی باتیں کر رہے تھے۔ دادا جان کی، دادی جان کی، آپی اور نانی جان کی۔ اماں ان کی باتیں سنتے سنتے سو گئی تھیں۔ صبح جلدی جلدی اس نے باقی ماندہ سامان سمیٹا تھا اور ابھی وہ سامان سمیٹ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ میراں اماں آ گئیں۔

ابا کمرے میں تھے وہ میراں اماں کو لے کر برآمدے میں ہی بیٹھ گئی۔

"اماں جان آپ بہت یاد آئیں گی۔"

"تم بھی مجھے بہت یاد آؤ گی سیمل بچہ..... تمہیں دیکھ کر ہمیشہ مجھے اپنی زلیخا یاد آ جاتی تھی لیکن اللہ تمہیں اپنے باپ کے سائے تلے خوش رکھے اور تمہاری اماں کو صحت و زندگی دے۔"

"اماں جان آپ میری اماں کے لیے بہت دعا کرنا۔"

"میں تو اب بھی ہر نماز کے بعد اس کے لیے دعا کرتی ہوں اور جب جب گل کے لیے دعا مانگتی ہوں اس کی سلامتی واپسی کی تو تیری ماں کے لیے دعا کرنا کبھی نہیں بھولتی۔"

"اماں جان۔" اس نے میراں اماں کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا۔

"میں آتی رہوں گی کبھی کبھی ملنے، آپ بھی آئیں گی ناں، میں اپنا ایڈریس اور فون نمبر دے جاؤں گی۔" میراں اماں نے سر ہلا دیا تھا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"وہ نوشیرواں آ گئے واپس؟" اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے میراں اماں نے بغور اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں یکدم مایوسی تیرنے لگی تھی۔ بے حد افسردہ سی ہو کر انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"تو آپ اکیلی ہیں گھر میں۔"

"نہ بچہ، وہ حیدر کی بیوی آ جاتی ہے۔" تب ہی ابا کمرے سے باہر آئے تھے۔

"سیمل بیٹی میں گاڑی لے کر آتا ہوں تم تیاری کر لو۔"

"جی!"

ابا سر جھکائے دروازہ کھول کر باہر چلے گئے تو وہ میراں اماں کو اماں کے پاس چھوڑ کر خود باہر آ کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور اس گھر میں گزرے سارے دن اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

☆☆☆

نوشیرواں کو اسلام آباد سے واپس آئے آج دوسرا دن تھا وہ کل شام اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔ اس نے گل کی بازیابی کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں ایک درخواست دی تھی۔ اب اس کی درخواست کا کیا بنا تھا وہ معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ رات کو صحن میں ٹہلتے ہوئے اس نے کئی بار اپنی سامنے بیسل کے گھر کی طرف مبذول کی تھیں لیکن ادھر خاموشی تھی۔ بیسل آج صحن میں اور برآمدے میں نہیں آئی تھی یا آئی بھی تھی تو وہ اس کے قدموں کی آہٹ نہیں سن پایا تھا۔ اس کی سسکیاں، اماں سے اس کی باتیں شاید وہ جلدی سو گئی ہو ایک نامعلوم سی افسردگی میں گھرا وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کمرا جہاں ٹیبل پر کارگل کا نقشہ پڑا تھا اور ٹیبل پر ہی ایک کونے میں گل کی ڈائری پڑی تھی۔

وہ کچھ دیر یونہی نقشے کو دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے میز کے کونے پر پڑی گل کی ڈائری اٹھائی اور میز کے پاس سے ہٹ آیا۔ ڈائری پڑھتے پڑھتے وہ سخت دکھی ہو گیا۔ جب سے یہ ڈائری اسے ملی تھی وہ نہ جانے کتنی بار اسے پڑھ چکا تھا۔

گل کہاں تھا..... تھا بھی یا نہیں۔ اگر کہیں ہوتا تو کبھی تو علاقے میں جاتا، حویلی کے ملبے پر جہاں ولدار بیٹھا اس کا انتظار کرتا تھا اور کہتا تھا۔

"گل لالہ آئے گا تو یہاں سے جاؤں گا۔" وہ ایک بار پھر گل کی ڈائری پڑھ رہا تھا۔ اس کی اپنی لکھی ہوئی نظمیں اور اس کا انتخاب سب ہی خوب صورت تھا۔ پھر وہ یونہی بے مقصد ڈائری کے خالی صفحے پلٹنے لگا۔ خالی صفحے جن پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا لیکن پھر بھی وہ صفحے پلٹ رہا تھا پھر ایک جگہ وہ ٹھٹک کر رک کر دیکھنے لگا۔ آخری صفحات سے کچھ پہلے اس صفحے پر پنسل سے کچھ لکھا تھا اور پھر لکھ کر ربڑ سے مٹانے کی معمولی سی کوشش بھی کی گئی تھی لیکن صاف پڑھا جا رہا تھا۔ یہ تو اس نے ایک نظر صفحے پر ڈالی۔

زمیر نہ عمر چھ سال
حکم جان عمر دو سال
شہناز سات سال
زرمینہ تاج نو سال

کوئی مجھے بتائے گا کہ ان میں سے کون دہشت گرد ہے۔ مٹے مٹے سے سترہ نام پڑھتے ہوئے نوشیرواں عادل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایک سانس لے کر اس نے ڈائری بند کر دی۔ یہ نام تو کے میراں اماں اور گل کے دل پر لکھے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی ڈائری ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر اسے میز پر رکھا اور باہر آ گیا۔ ایک بار پھر وہ صحن میں تھا۔ دیوار کے اس طرف سے موتیے کی خوشبو رچی ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ بہت سانس لے کر اس ہوا کو اپنے اندر جذب کر لیتا۔ بے طرح بیسل کو دیکھنے کے لیے مچل رہا تھا لیکن اس وقت وہ کہاں ادھر آ سکتی تھی۔ مچلتے دل کو سنبھالتے ہوئے اس نے برآمدے میں قدم رکھا تو میراں نے یکدم ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

"کیا بات ہے شیری بیٹا، کیوں اتنی رات تک جاگ رہے ہو، بچہ سو جاؤ اب جا کر۔" اس سر جھکا لیا۔

"جی اماں جان۔"

"بچے وہاں اسلام آباد میں کچھ خاص بات چلی؟" آخر میں کسی خدشے سے ان کی آواز لرزی۔

"نہیں اماں جان..... کچھ بھی نہیں..... شاید کبھی کچھ پتا نہ چلے۔" اس نے سر اٹھا کر اماں کو دیکھا۔ "آپ آرام کریں اماں جان میں آ رہا ہوں۔"

"بہت رات بیت گئی ہے شیری۔"

"اچھا!" تھکے تھکے انداز میں چلتا ہوا وہ میراں اماں کے پیچھے کمرے میں آ گیا اور دائیں طرف اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے جھک کر جوتوں کے تسمے کھولے اور ان کی طرف دیکھا۔ جو اپنے بیڈ پر لیٹ گئی تھیں۔

"اماں جان آپ نے دودھ پیا تھا، طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

"ہاں بچے میں ٹھیک ہوں۔" کمرے میں زرد روشنی کا بلب جل رہا تھا اور زرد روشنی میں میراں اماں کا چہرہ بھی زرد زرد لگ رہا تھا۔ جوتے اتار کر پاؤں اوپر بیڈ پر رکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔

"صبح مجھے جلدی جانا ہے، چھ بجے نکلوں گا گھر سے اگر میری آنکھ نہ کھلے تو جلدی جگا دیجیے گا۔"

"اچھا۔" میراں اماں نے کروٹ بدل لی۔

"کیا ہی اچھا ہوتا اماں جان اگر ہم دونوں بھی سب کے ساتھ — ہمارا ہونا بھلا کیا ضروری تھا اور ہم نے ان سب کے بعد جی کر بھی کیا کرنا تھا۔"

"ہمارا ہونا ضروری تھا یا نہیں — ہم دونوں کو اس نے کیوں بچا لیا، یہ تو اس کی حکمت، اس کی رضا ہے بچے۔" میراں اماں نے تڑپ کر پھر اس کی طرف کروٹ بدلی۔

وہ تکیہ درست کر رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے بچے، کیوں اس طرح اتنا قنوطی اور دکھی ہو رہا ہے۔"

"کیا دکھی نہیں ہونا چاہیے اماں جان، آپ دکھی نہیں ہوتیں، کیا آپ کو سب کچھ بھول گیا ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"شیری بیٹا —" ان کی آنکھوں سے کرب جھانکنے لگا تھا لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں جیسے لفظ اندر ہی کہیں مر گئے تھے۔ وہ آہستگی سے اپنے بیڈ سے اتر کر اس کے قریب آ گئیں اس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے انہوں نے اس کا سر چوم لیا۔

"بہت سی باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں شیری بچہ۔ ہمیں انہیں برداشت کرنا ہی ہوتا ہے۔"

"جی اماں جان۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا۔ پھر آہستگی سے انہیں الگ کیا..... ان کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ کیسی زخمی دل چیر دینے والی مسکراہٹ تھی۔ میراں اماں کو لگا جیسے ان کا دل کٹ رہا ہو، وہ لحہ بھر اسے دیکھتی رہیں۔

"آپ آرام کریں اماں جان، میں بھی سوتا ہوں۔" انہوں نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی اور اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئیں۔ نوشیرواں نے لیٹنے سے پہلے دائیں طرف دیوار پر موجود سوئچ کو آف کیا۔ کمرے میں یکدم اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ سے آنے والی مدھم سی روشنی نے کمرے کے اندھیرے کو ذرا کم کر دیا تھا۔ نوشیرواں نے دیکھا میراں اماں لیٹ گئی تھیں اور انہوں نے اپنا دوپٹا اپنے چہرے پر ڈال لیا تھا۔

"کیا کوئی اس ماں کے دکھ کی تھاہ تک پہنچ سکتا ہے۔" نوشیرواں نے لیٹے لیٹے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بہت سارے مناظر آنکھوں کے سامنے آتے رہے اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اسے جلدی آفس پہنچنا تھا اس لیے میراں اماں کا ناشتا بھی اس نے جلدی بنا دیا تھا۔ انہیں ناشتا دے کر وہ باہر صحن میں آیا تو اسے دیوار کے اس طرف سے بیسل کی آواز آئی تھی۔

"آپ کے لیے ناشتا ابھی بنا دوں یا پھر کچھ دیر سے۔" شاید وہ اماں سے پوچھ رہی تھی۔ نوشیرواں کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کا دل چاہا وہ دیوار پر سے جھانک کر اسے دیکھے۔ یکدم

اسے روبرو دیکھنے کی خواہش بہت شدت سے دل میں پیدا ہوئی تھی لیکن دل کی خواہش دل میں چھپائے وہ بے حد خوشگوار موڈ کے ساتھ میراں اماں کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جلدی واپس آ جائے گا لیکن پھر کچھ پرانے دوست مل گئے اور کرنل عارف زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ اس نے وہاں سے اماں کو فون کر دیا تھا کہ وہ کچھ دیر سے آئے گا اس لیے وہ حیدر کی بیوی کو بلا لیں۔ رات کا کھانا کرنل عارف کے گھر کھا کر وہ جب اپنی گلی میں داخل ہوا تو اس کی نظریں پہلے بیسل کے گھر پر پڑی تھیں۔ وہاں بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

"یہ تالا..... اور اس وقت..... اللہ خیر کرے' بیسل کی اماں ٹھیک ہوں کہیں....." لیکن پھر خود ہی اس نے اپنے خیال کو جھٹک دیا۔ "کیا پتا بیسل اور اماں اس وقت اماں جان کے پاس بیٹھی ہوں۔" بیسل کے تصور سے دل خوشگوار انداز میں دھڑکا۔

"لڑکی تم آہستہ آہستہ نوشیرواں عادل کے دل پر حکمران ہوتی جا رہی ہو۔" لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ میراں اماں کو سلام کر کے وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا برآمدے تک آیا اور کھوجتی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔

"آپ اکیلی تھیں حیدر کی بیوی نہیں آئی؟"

دو تین چکر لگائے ہیں اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی گئی ہے۔"

"اچھا!" اس نے غیر ارادی طور پر صحن کی مشترکہ دیوار کی طرف دیکھا تھا..... دیوار کے اس پار اندھیرا تھا۔ بجلی روشنی کا وہ بلب جو ساری رات برآمدے میں جلتا رہتا تھا آج نہیں جل رہا تھا تو ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔

"بیسل کی اماں جان تو ٹھیک ہیں نا؟ ان کے گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔" اس نے میراں اماں سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔" میراں اماں جیسے تھک سی گئی تھیں۔ وہاں ہی تخت پر ٹک گئیں اور ایک گہری نظر نوشیرواں کے چہرے پر ڈالی۔ وہ کچھ مضطرب سا ہو رہا تھا۔

"بیٹا دراصل وہ لوگ چلے گئے یہاں سے۔ بیسل کے ابا آئے تھے لے گئے انہیں۔"

"کیا...؟" اس کا اضطراب یکدم بڑھا۔

"کسی نے منع نہیں کیا..... روکا نہیں انہیں۔ آپ جانتی ہیں ناں اماں جان وہ..... بیسل اپنے ابا کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی..... مروان انہیں وہاں سے لے آیا تھا۔"

"ہاں بیٹا..... لیکن اللہ نے بڑا کرم کیا کہ صلح ہو گئی۔ بیوی اور بیٹی کا خیال آ گیا انہیں۔"

"اتنے سالوں بعد....." وہ تلخ ہوا۔

"اللہ کا کرم جب دل میں خیال ڈال دے۔ بڑی دعائیں کرتی تھی میں۔ اکیلی بچی کب تک کیسے بیمار ماں کو سنبھالتی۔"

"بیسل خوش تھی؟ وہ اپنی مرضی سے گئی ناں زبردستی تو نہیں کی اس کے والد نے..... وہ ڈرتی تھی کہ زبردستی لے جائیں گے۔" وہ بے چین سا تھا۔

"نہیں، زبردستی نہیں کی کسی نے، بہت خوش تھی کہہ رہی تھی کہ ابا بہت شرمندہ ہیں۔"

"اچھا.....!" نوشیرواں کی سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کہے، دل تھا کہ یکدم بجھ سا گیا تھا۔ وہ جس کی چاہ میں وہ اسلام آباد بریگیڈ پر مستقل کے باوجود نہیں ٹھہرا تھا وہ اس سے ملے بنا ہی چلی گئی تھی۔ کم از کم اس کا انتظار ہی کر لیتی۔ اس نے دل میں اس سے شکوہ کیا۔

"تمہیں سلام کہہ رہی تھی۔" میراں اماں بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا اس نے بیسل کو کھو دیا ہے؟" ایک گہرے احساس زیاں کے ساتھ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ نے کھانا کھا لیا اماں جان؟"

"ہاں بیٹا..... حیدر کی بیوی نے بتایا تھا تم کھانا کھا کر آؤ گے۔ تم نے کھانا کھایا؟"

"جی اماں جان۔" ایک انجانا سا دکھ بھرا احساس ہولے ہولے دل کو چیرنے لگا تھا۔

"آپ آرام کریں اماں جان، میں ابھی کچھ دیر کام کروں گا۔" گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے پھر نوشیرواں کی طرف دیکھا تھا۔ نوشیرواں کے چہرے پر پھیلی یاسیت کو دیکھ کر ان کا دل بوجھل سا ہو گیا۔

"بہت اچھی تھی بیسل..... کتنا خیال کرتی تھی ان کا..... کیسا محبت بھرا نرم دل دیا تھا اللہ نے اسے۔ بالکل زینے کی طرح..... اللہ اسے اپنے گھر اپنے باپ کے سائے تلے سکھی رکھے۔ بہت دکھ اور تکلیف دیکھی ہے اس نے۔" دل ہی دل میں سوچتی ہوئی وہ کھڑی ہوئیں۔ نوشیرواں نے بے اختیار ہی ان کا ہاتھ تھام لیا تھا پھر یونہی ہاتھ تھامے تھامے وہ انہیں کمرے میں لے آیا اور بہت محبت سے پوچھا۔

"اماں جان آپ کے لیے دودھ گرم کر کے لے آؤں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں چادر دے دو، میں اب سو جاؤں گی۔ تم بھی بیٹے جلدی سو جانا۔"

"جی اماں جان۔" انہیں لٹا کر اور ان کو چادر اوڑھا کر وہ باہر نکل آیا اور اس کے باہر جاتے ہی میراں اماں کی آنکھوں سے گرم گرم سیال بہہ نکلا تھا۔

کاش وہ اپنے اس بے حد پیارے، بے حد بہادر اور صابر بیٹے کی دل کی خوشی کا کوئی سامان کر سکتیں۔ بیسل کو دیکھ کر کئی بار ان کے دل میں بھی خیال آیا تھا کہ وہ بیسل کو نوشیرواں کے لیے مانگ لیں لیکن چاہنے کو تو دل بہت سی باتوں کو چاہتا ہے لیکن ہر چاہ پوری نہیں ہو سکتی۔ حسنہ نے انہیں بتایا تھا بیسل کا باپ ایک بے حد امیر شخص ہے اور بیسل کا گھر اتنا خوب صورت اتنا بڑا ہے کہ بندہ حیران رہ جائے۔ وہ مروان کی موت پر وہاں گئی تھی تب اس نے دیکھا تھا۔ بھلا کہاں نوشیرواں اور کہاں بیسل..... ان کی جھولی تو خالی تھی۔ وہ کیسے بیسل کے باپ کے سامنے..... پھیلاتیں۔ گھر بالکل خالی تھا بالکل تھی داماں..... گرم آنسوؤں سے تکیہ بھیگ رہا تھا اور باہر نوشیرواں تخت پر چپ بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار صحن میں مشترکہ دیوار کی طرف اٹھتیں اور پھر لوٹ آتیں۔ عجیب سا احساس زیاں تھا جو دل کو بھینچتا تھا اور تکلیف دیتا تھا۔

"کیا اس نے جانے سے پہلے ایک بار بھی مجھے نہیں سوچا ہو گا۔ کیا اس کا دل نہیں چاہا ہو گا کہ جانے سے پہلے وہ مجھ سے مل لے۔ آخر کچھ دنوں کا ساتھ تو تھا ہاں..... بہت طویل نہ سہی..... لیکن کبھی کبھی طویل رفاقتیں بھی بے معنی ہو جاتی ہیں اور لمحوں کا ساتھ عمر بھر پر محیط ہو جاتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ میں، نوشیرواں اپنے دل کی خالی مسند پر اسے بٹھا چکا ہوں۔"

آج باہر حبس تھا اور گرمی شدید..... ہوا کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کی شرٹ پسینے سے چپک رہی تھی لیکن وہ جیسے گرمی اور حبس سے بے نیاز صرف بیسل کو سوچ رہا تھا۔

"وہ ایسی تو نہیں تھی کہ یونہی بنا نشان دیے بغیر چلی گئی ہو گی۔ ضرور اماں جان کو اس نے اپنے گھر کا ایڈریس اور نمبر بتایا ہو گا۔" نا امیدی کے بادلوں میں

سے امید کی کرن چمکی تو وہ جیسے یکدم پُرسکون ہو گیا۔

"بھلا یوں بھی کوئی کرتا ہے ظالم لڑکی۔" اس کے لبوں کو ایک خوب صورت مسکراہٹ نے چھوا اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کام کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ اسے اپنے پروجیکٹ کے متعلق رپورٹ تیار کرنا تھی۔ کچھ دیر وہ یونہی قلم ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر سونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کو وہ میراں اماں کے کمرے میں ہی سوتا تھا۔ کہیں رات کو اچانک ان کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔ وہ آہستہ سے دروازہ دھکیل کر کمرے میں آیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میراں اماں شاید سو چکی تھیں۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرتے ہی جیسے بیسل کا تصور چھم سے آنکھوں کی پتلیوں میں اتر آیا۔ ڈری سہمی اسٹاپ پر کھڑی۔ باپ کے ڈر سے خوف زدہ ہو کر بھاگتی ہوئی۔ اس کے ساتھ مروان کی باتیں کرتی ہوئی۔ بیسل کو سوچتے سوچتے وہ جانے کب سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ میراں اماں ناشتا تیار کر رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی فجر کی قضا ادا کی اور باہر تخت پر آ بیٹھا۔ اماں ناشتا وہیں لے آئیں۔

"وہ بیسل نے کچھ بتایا تھا وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ کچھ اتا پتا، فون نمبر وغیرہ....." چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے جھجکتے ہوئے اماں سے پوچھا۔

"نہیں، جلدی میں تھی ..... مجھے بھی خیال نہیں رہا۔" انہوں نے نظریں چرائیں۔ اس کی چمکتی آنکھیں یکدم ماند پڑ گئیں تو بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"کہہ رہی تھی آؤں گی ملنے ..... اماں کو ساتھ لے کر چکر لگایا کروں گی۔" اس کی ماند ہوتی آنکھیں پھر چمک اٹھی تھیں۔ اماں نے امید کی ایک شمع اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی پھر وہ بھی دل گرفتہ تھا۔ کتنی عجیب

بات تھی وہاں عبداللہ کی بیوی نے اسے شادی کے لیے کہا تھا۔

"نوشیرواں بھائی اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔" عبداللہ اس کا اچھا دوست تھا انہوں نے میٹرک، ایف ایس سی اکٹھا ایک ہی کالج سے کیا تھا۔ وہ جب بھی راولپنڈی، اسلام آباد آتا اس کے پاس ہی ٹھہرتا تھا۔ اور یہی بات بریگیڈیر مصطفیٰ نے بھی کی تھی۔

"نوشیرواں تمہیں اس وقت کسی کی رفاقت کی ضرورت ہے ..... تمہارے ساتھ جو سانحہ ہوا وہ بہت بڑا ہے۔ اس پگلی کی گمشدگی تم ہر بار مجھے سے زیادہ کمزور اور ڈسٹرب لگتے ہو۔ تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔ دوسرا ہٹ ملے گی، کوئی دکھ بانٹنے والا تو ہوگا ..... کہو تو تمہاری بھابی سے بات کروں؟"

"نہیں ابھی نہیں۔" اسے بیسل کا خیال آیا اور پھر راولپنڈی سے لاہور تک کے سفر میں وہ مسلسل بیسل کے متعلق سوچتا رہا تھا کہ وہ جا کر اس سے سب کچھ کہہ دے گا۔ اپنی بے چینی و بے قراری اپنے احساسات، عمر بھر کے لیے اس کی رفاقت کی چاہ اور اپنی محبت کا اعتراف ..... لیکن کبھی کبھی وقت انسان کے ساتھ کیسا مذاق کر جاتا ہے۔ میراں اماں نے اس کے ہاتھ میں آس کا دیا تھما تو دیا تھا مگر مایوسی ہر روز بڑھتی جا رہی تھی۔ کتنے سارے دن گزر گئے تھے۔ وہ پلٹ کر نہیں آئی تھی۔ آتی تو میراں اماں ضرور بتاتیں وہ جب بھی آ کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتا وہ نظریں چرا لیتیں۔ وہ اتنی بے مروت نہیں تھی کہ اتنی جلدی سب کو بھول گئی۔ ثمنہ تو اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ دکھ درد کی ساتھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ثمنہ اور اس کے گھر والوں نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ یقیناً ان سے تو ملنے آتی ہو گی۔ کئی بار اس کا جی چاہا وہ ثمنہ کے گھر جائے۔ ثمنہ سے پوچھے

لیکن حنہ لڑکی تھی اور پردہ کرتی تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ تب ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بظاہر سرسری انداز میں مہران اماں سے کہا تھا۔

"حنہ کو سیمل کے گھر کا پتا ہوگا۔ آپ حنہ سے پتا پوچھ لیں تو کسی روز آپ کو ملانے لے چلوں گا۔"

"میں نے حنہ سے پوچھا تھا۔ اسے نہیں معلوم۔"

"اچھا!" اسے حیرت ہوئی تھی۔ "کمال ہے۔" وہ اماں کو جھٹلا نہیں سکتا تھا حالانکہ اس کا دل نہیں مان رہا تھا یہ بات۔ وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں۔

"اس کا باپ بہت بڑا آدمی ہے۔۔۔ یہ بڑی سی گاڑی تھی اس کی شیری بیٹا۔۔۔ دو تین ملازم آئے تھے سامان پیک کرنے اور لے جانے کو۔۔۔" مہران اماں پتا نہیں اسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ جو وہ سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"کیا پتا اس کے ابا نے منع کر دیا ہو۔۔۔ اسے پسند نہ ہو۔۔۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں جو اپنے ہی اسٹیٹس کے لوگوں سے میل جول رکھنا پسند کرتے ہیں۔" مہران اماں نے وضاحت کی تھی لیکن وہ وضاحت کرتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔ "اور ممکن ہے انہوں نے انہیں یہاں سے لے جانے کے لیے سب ڈراما کیا ہو۔ معافی مانگنے کا۔ شرمندہ ہونے کا۔" اس کا دل سیمل کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ ڈری سی خوف زدہ سی سیمل اب کیسے رہتی ہو گی اس گھر میں اب جبکہ مروان بھی نہیں تھا۔ وہ کتنی تنہا ہو گی۔۔۔ کتنی اکیلی۔۔۔ اماں تو۔۔۔

"نہیں۔ مجھے اس کے متعلق کچھ غلط نہیں سوچنا چاہیے۔۔۔ وہ بہت خوش ہو گی اور خوشی میں اسے غم کے ساتھی بھول گئے ہوں گے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو!"

ایک بار وہ سیمل سے اپنے جذبوں کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے بے حد بے حساب محبت کرنے لگا ہے لیکن سیمل نہیں تھی۔ اور یہ اگست 2007ء کا اینڈ تھا جب مالک مکان نے گھر خالی کرنے کو کہا تھا۔ اس نے سیمل وغیرہ کے جانے کے بعد دوسرا حصہ کرائے پر نہیں چڑھایا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ یہ گھر فروخت کرنا چاہتا تھا اور اب یہ گھر فروخت ہو گیا تھا اور انہیں ایک ماہ کے اندر اندر یہ گھر خالی کرنا تھا۔ اس نے اپنے آفس کے قریب ہی ایک گھر لے لیا تھا۔ سیمل شاید کبھی اماں جان سے ملنے آئے یا حنہ سے ایک آس تھی لیکن اب اگر وہ آئی بھی تو۔۔۔ آس کا دیا ٹمٹمانے لگا تھا۔ لیکن وہ اسے بجھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ کئی بار وہ اسٹاپ پر گیا تھا۔

شاید کبھی وہاں وہ کھڑی نظر آ جائے۔ لیکن پھر اسے خود ہی اپنی حماقت پر ہنسی آ گئی۔ اب بھلا اسے اسٹاپ پر کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کئی بار اس نے بلاوجہ ہی گلشن آباد کے چکر لگائے تھے لیکن وہ نظر نہیں آئی تھی کہیں بھی نظر نہیں آئی تھی۔ ایسی بے مروت تو نہ تھی وہ۔۔۔ وہ تو بہت محبت کرنے والی تھی۔ کہیں اس کے ابا نے اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی اس کا دل کہتا تھا کہ وہ ایسی نہیں تھی۔ اتنی بے مروت اتنی بدلحاظ۔

☆☆☆

اور وہ واقعی ایسی نہیں تھی۔ وہ کبھی اپنے دکھ کے ساتھیوں کو نہیں بھول سکتی تھی جنہوں نے آٹھ سال اس کا ساتھ دیا تھا جو روی کے جانے کے بعد اس کے لیے چھاؤں بن گئے تھے۔ جنہوں نے اس کے آنسو پونچھے تھے جو اس کے ساتھ مل کر روئے تھے۔ وہ مہینے میں ایک یا دو چکر ضرور گلشن آباد کے لگاتی تھی۔ کبھی اماں کے ساتھ کبھی اکیلے۔۔۔ سب سے مل کر پھر وہ

بہت سارا وقت حمنہ کے ساتھ گزار کر آ جاتی تھی۔ میراں اماں سے بھی دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ تھی ہی بڑی ان کے پاس بیٹھی رہی تھی لیکن دونوں بار ہی اس کی نوشیرواں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر نہیں تھا۔ دونوں بار ہی اماں نے بتایا تھا وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے..... نہیں تو وہ اس کا انتظار کرتی۔ وہ نوشیرواں سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ اسے ابا کے متعلق بتانا چاہتی تھی کہ وہ کتنا بدل گئے ہیں۔ کس طرح اس کا اور اماں کا خیال رکھ رہے ہیں اور اماں پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں۔ ہاں کبھی کبھی وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتیں ساکت اور اُلجھی اُلجھی سی لیکن ان کی آنکھوں میں خالی پن نہیں ہوتا۔ بس وہ کہیں گم ہو جاتیں۔ کسی سوچ کسی خیال میں گم..... وہ نوشیرواں کو بتانا چاہتی تھی کہ ابا نے بہت بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا ہے۔ سب ان کی اس بتدریج بہتری سے مطمئن ہیں۔ دو دفعہ اماں کے لیے ڈاکٹروں کا بورڈ بھی بیٹھ چکا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ مزید بہتری آئے گی۔ وہ نوشیرواں کو یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ وہ اسے مس کر رہی ہے۔ لیکن نوشیرواں اسے نہیں ملا تھا اور تیسری بار جب آئی تھی تو میراں اماں وہاں سے جا چکی تھیں اور حمنہ آپا، حیدر کی بیوی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے کہاں گھر لیا ہے۔

''کم از کم میراں اماں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اسے بے حد دکھ ہوا تھا۔ ''یہاں سب ان سے کتنی محبت کرتے تھے۔ کم از کم حیدر کی بیوی کو تو پتا ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بھی لاعلم ہے اور اب شاید میں کبھی دوبارہ نوشیرواں سے نہیں مل سکوں گی۔'' اس روز وہ حسن آباد سے واپس آئی تو بہت اداس تھی۔ اس نے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے ابا، اماں کے ساتھ باتیں کرتے اور کچن میں کھانا بناتے ہوئے نوشیرواں کے ساتھ

پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی ہر ملاقات کو جانے کتنی بار سوچا تھا۔

نوشیرواں اور میراں اماں کتنے بھلے لگے ہوا کرتے تھے۔ اس سے ایک روی کی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں اس گھر میں آ کر وہ بہت یاد آتا تھا۔ قدم قدم پر اس کی یادیں بکھری تھیں۔ جب وہ ابا کے ڈر سے سیڑھیوں کے نیچے چھپی تھی، جب وہ ریلنگ کے پیچھے چھپ کر ابا اور اماں کو دیکھتی تھی تو روی اسے بازوؤں میں چھپا لیتا تھا اور کہانیاں سناتا تھا۔ نیلی کے ہوم سوئٹ ہوم کی روز ان کے بھائی رہی کی۔ اسے کاش کہ انہیں مل جائے۔ اچانک اور اسے کاش وہ نوشیرواں سے دکھ بانٹ سکے۔ خواہش اچانک ہی دل کی زمین پر اگ آئی تھی ایک کو وہ ٹھٹک گئی۔

''نہیں۔ کیا میں نوشیرواں کی رفاقت خواہاں ہوں۔ کیا میں اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ نہیں، یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟'' اس نے خود ہی خود کو جھٹلایا۔

''بھلا نوشیرواں مجھ سے.....'' اور رات جب وہ بیڈ پر لیٹی تو اسے لگا جیسے نوشیرواں سے محبت کرنے لگی ہے۔ اگر یہ ہے تو وہ اس محبت کو پانے سے پہلے ہی کھو چکی ہے۔ اس نے خود سے اعتراف کیا اور پھر آنسو آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہوتے چلے گئے۔ کیا سہیل خان کی زندگی میں ادھوری خوشیاں آتی رہیں گی۔ روی تھا تو ابا تھے۔ اور اب ابا ہیں تو روی نہیں ہے اور نوشیرواں بھی نہیں ہے۔

اور پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ انتظار کرتی رہی شاید کبھی میراں اماں کا فون آ جائے کبھی وہ ملنے آ جائیں۔ ان کے پاس اس کا نمبر

اسے فون تو کر سکتی تھیں پھر ہو سکتا ہے کل نہ کیا ہو.... وہ کسی سے سنا اپنے علاقے میں واپس چلے گئے ہوں۔ لیکن آپ کی ڈوری کو لوٹی ہی نہ تھی وہ جب حسن آباد جاتی حمنہ سے میراں اماں کے متعلق ضرور پوچھتی۔

''وہ ہوتیں تو ضرور آتیں کبھی نہ کبھی۔'' حمنہ نے ایک بار کہا۔

''مطلب.....؟'' وہ کانپ گئی۔ وہ ایسا کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ حمنہ کے گھر سے آ کر وہ کئی دن تک اپ سیٹ رہی۔

ایک روز اس نے ایک جگہ فوجی فاؤنڈیشن کا بورڈ لگا دیکھا تھا تو کتنی ہی دیر تک گاڑی ایک طرف پارک کروا کے وہ ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔ کیا پتا یہاں ہی کہیں نوشیرواں کا دفتر ہو اور وہ ادھر جاتا یا وہاں سے آتا دکھائی دے جائے پھر خود ہی اپنی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی تھی اور اس نے ڈرائیور سے گھر چلنے کو کہا۔ گھر آ کر وہ بہت دیر تک روی کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ روی کی کتابیں دیکھتے ہوئے اسے ماسو چاچا بھی یاد آنے لگے۔ ماسو چاچا جو ان کے لیے قیمتی اور اچھی کتابیں چھانٹ کر رکھتے تھے۔ اس نے سوچا۔

''پتا نہیں وہ اب بھی وہاں کتابیں بیچتے ہوں گے یا نہیں۔ شاید ان کا پڑھا لکھا بیٹا اب کسی اچھی پوسٹ پر ہو اور انہوں نے کام چھوڑ دیا ہو لیکن ایک بار میں ضرور انار کلی جا کر دیکھوں گی کیا پتا وہ اب بھی وہاں بیٹھتے ہوں۔ اور ان کا بیٹا اب بھی اچھی سی جاب ڈھونڈ رہا ہو..... پیپرز کے بعد وہ فارغ تھی۔ سو کتابیں پڑھتی، کچن میں نئی نئی ڈشز بناتی اور ابا اماں کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ ابا اب بھی بہت شاندار لگتے تھے۔ ان کے سیاہ بالوں میں گرے بالوں کی آمیزش نے انہیں بہت سوبر بنا دیا تھا اور اماں تو بالکل ویسی ہی لگتی تھیں، دس بارہ سال پہلے والی۔ وقت جیسے انہیں

چھوئے بغیر گزر گیا تھا۔ ان کے گھنے سیاہ بال اب بھی اتنے ہی لمبے اور چمکیلے تھے۔ ان کا رنگ اب بھی اتنا ہی نازک تھا جب وہ نفیس کپڑے، جب تن کیے جھلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ نفیس سی بنی ابا کے ساتھ کھڑی ہوتیں تو ابا بڑے فخر سے انہیں دیکھتے رہتے۔ وہ اب بھی پہلے جیسی ہی کم گو تھیں لیکن ابا انہیں بولنے پر اکساتے تھے۔ کبھی وہ بے بسی سے انہیں دیکھتیں اور کبھی ان کی باتوں کا جواب دیے جاتیں۔

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے ایک کے بعد ایک دن بھر کی مصروفیت کے بعد جب وہ رات کو سونے کے لیے لیٹتی تو اس کا دل بھرا ہوتا..... جی چاہتا کہ چپکے چپکے روتی رہے..... دل کو جیسے کوئی ہولے ہولے مٹھیوں میں بھینچ رہا ہو..... اسے روی کے علاوہ نوشیرواں بھی بے طرح یاد آتا تھا۔ اس رات اس نے روی کو بڑے دنوں بعد خواب میں دیکھا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اور نہ جانے کس بات پر ہنس رہا تھا۔ وہ دونوں انار کلی میں ماسو چاچا کی دکان کے پاس کھڑے تھے۔ وہ صبح اٹھی تو اس نے سوچا وہ آج ضرور انار کلی جائے گی اور ماسو چاچا سے کتابیں خریدے گی اور انہیں یہ بھی بتائے گی کہ وہ جو اس کا بھائی مروان تھا، وہ شہید ہو گیا اس لیے وہ اتنے عرصے وہاں نہیں آئی۔ دسمبر شروع ہو چکا تھا اور اس سال بھی لاہور میں ٹھیک ٹھاک ٹھنڈ تھی۔ اس کا بستر سے نکلنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ناشتا اس نے کمرے میں ہی منگوالیا تھا۔ سارا دن بیڈ پر لیٹی کتابیں پڑھتی رہی۔ اماں کی اب اسے فکر نہیں تھی۔ ابا تھے نا ان کا خیال کرنے کو اور آج تو یوں بھی اتوار تھا۔ ابا گھر پر ہی تھے۔ عصر کے بعد وہ بستر سے نکلی اور تیار ہو کر نیچے آئی۔ اماں لاؤنج میں کھڑی تھیں۔ لائٹ براؤن اور سیاہ کڑھائی کے امتزاج والے سوٹ کے ساتھ سیاہ ہی نفیس ایمبرائیڈری والی شال اوڑھے وہ بہت باوقار لگ

رہی تھیں۔ ابا بار بار انہیں مسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں شاید کہیں جا رہے تھے۔ ایک خوشی بھرے احساس کے ساتھ اس نے انہیں دیکھا۔

"ہم ایک پارٹی میں جا رہے ہیں، تم چلو گی؟" ابا نے پوچھا تھا۔

ابا اماں کو ساتھ لے کر کسی پارٹی میں جا رہے تھے جبکہ اماں مکمل طور پر نارمل نہیں تھیں اور کبھی انہیں ان کے ساتھ چلتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی۔

احسانِ تشکر سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"نہیں ابا جی، آپ جائیں، مجھے کچھ کتابیں خریدنے اردو بازار جانا ہے۔"

"تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گی گڑیا؟" اماں پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں۔" وہ مسکرا دی۔

"ڈرائیور لے جاؤ بیٹی، ادھر رش بہت ہوتا ہے، خود مت ڈرائیو کرنا۔"

"جی ابا جی۔" اب ابا مسکرا کر اماں کو دیکھ رہے تھے۔

"ہم بھی چلیں۔" انہوں نے اپنا ہاتھ اماں کی طرف بڑھایا تھا ان کا ہاتھ تھامنے کو۔ ان سب کے لیے وہ کتنا ترسی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کی نمی کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر آ گئی۔ پورچ میں دونوں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جب وہ یہاں سے گئے تھے تب بھی یہاں دو گاڑیاں ہوتی تھیں۔ ایک گاڑی گھر کے لیے تھی اور دوسری ابا کے ذاتی استعمال کی۔ ڈرائیونگ اسے روفی نے سکھائی تھی لیکن روفی کے ساتھ ہونے کے باوجود وہ مین روڈ پر جاتے ہوئے خوف زدہ ہو جاتی تھی لیکن ابا کے ساتھ اس نے کئی بار پریکٹس کی تھی اور انہی کے دیے اعتماد کے سہارے وہ اب کئی بار اکیلے ہی گاڑی لے کر حسنہ سے ملنے چلی گئی تھی۔

اس نے ڈرائیور سے انارکلی چلنے کو کہا۔ بازار پہنچ کر اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ کپڑوں کی دکان کے سامنے تختے پر کتابیں سجائے حامد چاچا ہی بیٹھے تھے۔ ویسے ہی صاف شفاف دھلے ہوئے سفید کپڑے اور سفید پگڑی باندھے وہ کتابیں ادھر ادھر کر رہے تھے۔ شاید گاہکوں نے ان کی ترتیب خراب کر دی تھی۔ آج بھی انہوں نے آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا تھا۔ لیکن اب وہ کچھ کمزور لگے تھے۔ ان کے بالوں میں سفیدی بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ داڑھی تو بالکل سفید تھی۔

"چاچا جی۔" وہ ان کے سامنے زمین پر ہی دوزانو بیٹھ گئی تھی۔

حامد چاچا نے ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ ان کی سرمگیں آنکھیں بے حد روشن تھیں اور پیشانی پر سجدوں کا نشان چمک رہا تھا۔ انہوں نے بنا کچھ کہے مڑ کر اپنے پیچھے رکھے کارٹن سے کچھ کتابیں نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھیں۔

"یہ میں تمہارے لیے رکھتا رہا۔"

"میرے لیے...؟" اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ آخری بار جب وہ آئی تھی تو جنوری 1999ء تھا اور اب 2007ء ختم ہو رہا تھا۔ آٹھ سال بعد وہ اسے وہاں کتابیں نکال کر دکھا رہے تھے جیسے وہ ابھی کل ہی تو آئی تھی۔

"آپ نے مجھے پہچان لیا؟ آپ کو یقین تھا میں کسی دن آؤں گی اور مروان تو ——"

"مجھے انتظار تھا۔" وہ ہمیشہ کی طرح مختصر بات کرتے تھے۔

"لیکن مروان تو...."

"اللہ کی امانت تھی۔" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کیا۔ کوئی بزرگ ہیں، کوئی ولی۔"

"میں نے اخبار میں پڑھا تھا اور اس کی تصویر دیکھی تھی۔"

"پھر بھی آپ کو انتظار تھا میں کسی روز آؤں گی کتابیں لینے۔" وہ مسکرا کر ایک اور کتاب نکالنے لگے۔

"آپ نے جتنی بھی کتابیں ہمارے لیے رکھی ہیں۔ ان کا بل بنا دیں۔" وہ عقیدت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کارٹن سے کتابیں نکال کر تختے پر رکھنے لگے۔

"آپ دیکھ لیں ان میں سے کون کون سی؟"

"سب...... سب چاچا جی...... وہ سب جو آپ نے ہمارے لیے رکھی ہیں۔" وہ کھڑی ہوگئی اور اس نے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ سامنے روڈ پر جو کوئی بھی جا رہا تھا۔ وہ چلتے ہوئے ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا۔ اس کا دراز قد دور سے بھی اسے نمایاں کر رہا تھا آس پاس چلتے سب لوگوں میں۔ وہ یکدم روڈ کی طرف تیز تیز چلنے لگی۔ وہ کہیں لوگوں کے ہجوم میں گم نہ ہو جائے۔ وہ تقریباً بھاگنے لگی تھی۔ آس پاس کئی لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا لیکن وہ بھاگتی رہی۔ جب اس کے قدم نوشیرواں کے قدموں کے برابر پہنچے تھے تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔ نوشیرواں نے یکدم پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

"یسل......" وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے پھر یسل کی نظریں جھک گئیں۔

"یوں بھی کوئی کرتا ہے یسل ایسے...!" نوشیرواں کے لبوں پر بے اختیار شکوہ آیا تھا۔ "نہ کوئی پتا، نہ کوئی نشان، میں نے ان پانچ ماہ میں کتنا تلاش کیا ہے تمہیں۔"

"اور یہی بات میں کہوں تو...... میں تو میراں اماں سے مل کر پتا کر آئی تھی سب، فون نمبر، ایڈریس سب کچھ ہی تو دیا تھا۔ بعد میں بھی دو بار ملنے گئی۔ انتظار رہا کہ آپ میراں اماں کو لے کر اماں ابا سے ملنے آئیں گے۔" یسل کے لبوں پر شکوہ آیا تو ایک لمحے کی حیرت کے بعد نوشیرواں نے جان لیا کہ میراں اماں نے اسے نارسائی کے دکھ سے بچانا چاہا تھا وہ نہیں جانتی تھیں یہ سب اپنے اختیار میں کب ہے۔ ان پانچ ماہ کی ہر صبح اور ہر رات اس نے خود اعتراف کیا تھا وہ یسل حبیب خان کی محبت میں طرح گرفتار ہو چکا ہے۔

"میں نے تمہیں بہت مس کیا یسل۔" وہ دونوں اب واپس جا رہے تھے۔

"اور میں نے بھی۔" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یسل نے اعتراف کیا۔

"اور میں...... مجھے لگتا ہے کہ......" اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے اپنے کان کی لو مروڑا۔

"مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے یسل، میں نوشیرواں عادل...... میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ میں بھی اس طرح بھرے بازار میں لوگوں کے ہجوم میں چلتے ہوئے تم سے اظہار محبت کروں گا۔ میں نے تو سوچا تھا یسل کسی روز بڑے خوب صورت انداز میں تمہارے سامنے ایک گھٹنا موڑ کر بیٹھے قدیم رومن انداز میں تمہیں گلابوں کا بوکے دے کر کہوں گا۔ یسل میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں میری محبت کو قبول کرلو۔" وہ بولے سے "لیکن......"

"میں نے اس محبت کو قبول کیا۔" چلتے چلتے رک کر یسل نے اس کی طرف دیکھا۔ نوشیرواں بھی رک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ مبہوت سا ہو کر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے پھر یسل کی نظریں جھک گئیں۔

"کپ، سوئیاں، بٹن۔" کسی ہاکر نے آواز لگائی تو نوشیرواں چونکا۔ اب وہ دونوں پھر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"محبت کا اس طرح سر بازار اظہار بھی اتنا برا نہیں ہے۔" وہ پھر ہنسا تھا۔

"لیکن کاش ہم کہیں تنہا ہوتے تو اس اظہار محبت پر......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی وہ ماموں چاچا کی تختے نما دکان کے پاس کھڑے تھے۔ ماموں چاچا نے دس بارہ کتابوں کا ایک بنڈل سا بنا دیا تھا۔

"چاچا جی یہ میجر نوشیرواں ہیں۔ مردان کے ساتھ ہی تے کارگل کے محاذ پر۔"

ماموں چاچا مسکرائے تھے۔

"میں ان پانچ ماہ میں کئی بار یہاں آیا ہوں۔" نوشیرواں مسکرایا۔

"کہاں کہاں نہیں تلاش کیا تمہیں...... اور پتا ہے جب بھی میں نے ماموں چاچا سے پوچھا۔ وہ نہیں آئی کتابیں لینے تو چاچا کہا کرتے تھے۔ وہ ضرور آئے گی لیکن یسل مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ تم سے میری ملاقات یہاں ہی ہوگی۔"

"آپ کے بیٹے چاچا جی!" بل ادا کرتے ہوئے یسل کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔

"انہیں کوئی بھی جاب ملی اپنے مطلب کی؟"

"جس کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔" ماموں چاچا جواب دے کر کتابیں ترتیب سے رکھنے لگے تھے اور نوشیرواں کے ساتھ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے یسل سوچ رہی تھی۔

"ماموں چاچا اشفاق احمد کے بابے نہیں لیکن ان میں اشفاق احمد کے بابوں جیسا کچھ ہے ضرور......"

☆☆☆

"میرا دل نہیں مانتا بیٹا، بالشبہ نوشیرواں اچھا لڑکا ہے۔ اس کی والدہ بھی بہت اچھی ہیں۔ بہت محبت کرنے والی، وہ یقیناً ہماری یسل کو بہت اچھی طرح رکھیں گے لیکن ایک تو دونوں میں عمر کا فرق بہت ہے۔ تقریباً گیارہ سال۔ نوشیرواں ہمارے روحی کا ہی تو ہم عمر ہے۔" اور کچن سے باہر لاؤنج میں آتی یسل وہیں رک گئی۔ ابا دائیں طرف صوفے پر بیٹھے تھے اور اماں بالکل سامنے بیٹھی تپائی پر ٹوکری رکھے مٹر چھیل رہی تھیں ایک بہت پرانا منظر یسل کی آنکھوں کے سامنے آ کر گزر گیا جب اماں لاؤنج میں بیٹھ کر کوئی سبزی کاٹتیں یا ایسا ہی کوئی کام کرتی تھیں تو ابا کا عتاب اماں پر ٹوٹتا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لے کر دروازے سے جھانکا۔ ابا کچھ افسردہ اور پریشان بیٹھے تھے۔

"میں عمر کے فرق کو نظر انداز بھی کردوں بیٹا لیکن ماحول کے فرق کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ذات، برادری، امیری غریبی سب نظر انداز کی جاسکتی ہے لیکن وہ تو ایک بالکل مختلف کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ رسم و رواج، ماحول ہر چیز...... پھر وہ علاقہ اس علاقے کے تو اپنے قانون اپنے رواج ہیں۔ بے شک اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گزارا ہے۔ اب بھی یہاں ہی رہ رہا ہے لیکن اپنی جڑیں، اپنی زمین تو کوئی نہیں چھوڑ سکتا...... تم بھی تو کچھ کہو ناں بیٹا۔" وہ یکدم بولتے بولتے اماں کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ "کوئی رائے، کوئی مشورہ......"

"میں کیا کہوں؟" انہوں نے سر اٹھا کر بے بسی سے دیکھا۔

"ہاں تم!" انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"بیٹا کیا یسل بھی ایسا چاہتی ہے، انہوں نے جو دست سوال دراز کیا ہے تو کوئی جواز تو ہوگا ناں ان کے پاس۔"

"پتا نہیں۔" اماں اب بھی بے بسی سے انہیں

دیکھ رہی تھیں۔

"تو مینا منع کردو، میران اماں کا فون آئے تو انہیں بتا دینا۔"

اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ پیچھے مڑ کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بسمل نے کاؤنٹر سے ہی ٹیک لگالی۔

☆☆☆

اماں پہلے سے بہت بہتر تھیں۔ وہ بہت سارے کاموں میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ کچن کا کام، ابا کے کپڑے وغیرہ نکالنا، وہ بہت شوق سے کرتی تھیں۔ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ روحی شہید ہو چکا ہے لیکن شاید وہ ابھی اتنی ٹھیک نہیں تھیں کہ اس کی زندگی کے متعلق کوئی رائے دے سکیں اور وہ ان سے اپنے دل کی بات کر سکے۔ انہیں بتا سکے کہ نوشیرواں کی اس کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ وہ نوشیرواں کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ اور، اور ابا سے بھی وہ یہ بات نہیں کر سکتی۔ ابا کیا سوچیں گے کہ..... اور ابا تو پہلے ہی روحی بھائی سے کہتے تھے..... وہ بدل گئے ہیں لیکن کیا پتا..... وہ کیا سوچیں۔

"نہیں..... میں کبھی ابا سے دل کی بات نہیں کر سکتی۔" یکایک اس کا دل ڈوبنے لگا۔ "تو کیا میں نوشیرواں کے علاوہ کسی اور..... اور کیا نوشیرواں اس انکار کو برداشت کر لے گا۔ وہ کتنا خوش تھا اس روز اس طرح اچانک مل جانے پر۔"

"پتا ہے بسمل میں مایوس ہونے لگا تھا کہ شاید میرا تمہارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔" پارکنگ کی طرف اس کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"اور اب اس طرح اچانک تم مل ہو تو یہ خوشی مجھ سے سنبھالی نہیں جا رہی..... پتا ہے بسمل مجھے مدت بعد کوئی خوشی ملی ہے۔" اور اس کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ بسمل نے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے سوچا اور آنسو اس کے اندر گرنے لگے قطرہ قطرہ کر کے۔ اس روز کتابوں کا بنڈل گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے اس نے سیٹ پر پڑے بسمل کے موبائل کو دیکھا اور اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بسمل نے اپنا نمبر اسے دے دیا تھا۔

"میں آؤں گا بسمل، اماں جان کو لے کر روز ملنے۔" وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اماں بہت خوش ہوں گی وہ ہمیشہ ہی میران اماں سے مل کر خوش ہوتی تھیں۔ آپ ضرور آئیے۔"

"تم منع بھی کرو گی تب بھی آؤں گا بسمل میرے تو سارے راستے اب تمہاری طرف ہی جاتے ہیں۔" وہ بے حد سرشاری سے مسکرائی تھی اور اس نے اماں کو نوشیرواں کے متعلق بتایا تھا اور یہ بھی کہ کسی دن میران اماں ان سے ملنے آئیں گی اور پھر وہ اگلے ہی دوسرے دن میران اماں کے ساتھ آگیا تھا۔ ابا اس سے مل کر بہت خوش ہوئے اور بہت دیر تک اس سے روحی کی باتیں کرتے رہے۔ اس سے روحی کی باتیں کرتے ہوئے کئی بار ابا کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ روحی کے آخری لمحوں میں اس کے ساتھ تھا۔ اس نے روحی کے آخری لمحوں کے متعلق جاننا ابا کو اچھا لگا تھا۔ انہوں نے اس سے پھر بھی آتے رہنے کو کہا تھا اور اس کے جانے کے بعد بھی ابا بہت دیر تک اس کے متعلق باتیں کرتے رہے تھے اور اس کے خاندان کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی پر وہ بے حد دکھی ہوئے تھے۔ اس رات جب وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کتابیں سیٹ کر رہی تھی تو تکیے کے پاس پڑا موبائل بج اٹھا اس نے چونک کر فون اٹھایا دوسری طرف نوشیرواں تھا اور اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔

"ابھی چار گھنٹے پہلے تو آپ یہاں سے گئے ہیں اور میں خیریت سے تھی۔" نچلا ہونٹ دبائے اس نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا تو وہ مسکرائی تھی۔

"بسمل کبھی کبھی کوئی شخص اتنا اہم کیوں ہو جاتا ہے کہ زندگی اس کے بغیر ادھوری لگنے لگتی ہے۔ مجھے بھی تمہارے بغیر اپنی زندگی ادھوری لگنے لگی ہے۔" بسمل خاموش رہی تھی وہ کیا کہتی اسے تو خود یہی لگتا تھا جیسے نوشیرواں اس کی زندگی کا ہی حصہ ہو۔ پچھلے چھ ماہ وہ نہیں تھا تو اسے اپنی زندگی نامکمل لگتی تھی۔ ادھوری، خالی اور ویران سی۔

"سنو بسمل کیا میں تمہیں پرپوز کر سکتا ہوں؟ دیکھو یہ ہے تو آکورڈ سا۔ تمہیں اس طرح یوں رات کے اس پہر پرپوز کرنا..... لیکن بسمل۔" وہ ہنسا تھا۔ "بارش کے ہجوم میں تم سے اظہار محبت کرنا اور اب اس وقت پرپوز کرنا ہے تو کچھ عجیب سا لیکن یار کیا کروں۔ ابھی اسی وقت چند لمحے پہلے مجھے خیال آیا ہے کہ مجھے تمہیں پرپوز کر دینا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور..... اور میں خالی ہاتھ تہی داماں رہ جاؤں۔ میں اتنے رشتے کھو چکا ہوں کہ اب مجھ میں کوئی اور رشتہ کھونے کی سکت نہیں ہے۔ بتاؤ نا، بسمل میں صبح اماں جان کو بھیج دوں؟"

"لیکن اتنی جلدی....." وہ اپ سیٹ ہو گئی تھی۔

"میں نے تو ابھی ابا کی محبتوں کو صحیح طرح سے محسوس بھی نہیں کیا۔ میں ابھی انہیں انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی اماں اور ابا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں..... میں..... مجھے لگتا ہے جیسے میں نے پہلی بار جانا ہے کہ باپ کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں ابا کے ساتھ رہی ہوں۔ اتنے بہت سے سال لیکن تب وہ اجنبی لگتے تھے۔ اب پہلی بار مجھے لگا ہے وہ میرے ابا ہیں پھر ابھی اماں، ابا دونوں کو ہی میری ضرورت ہے۔"

وہ یکدم ریلیکس ہو گیا تھا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں بسمل کہ تم آج ہی رخصت ہو کر میرے ساتھ آجاؤ۔ میں تو بس اپنے اس سہمے ہوئے خوف زدہ دل کے یقین کا کوئی سامان کرنا چاہتا ہوں جو ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں بے خبری میں تمہیں میں کھو نہ دوں۔ بس ایک بار مجھے یقین ہو جائے کہ تم میری ہو تو پھر جب تم نے چاہا جب جو تم نے کہا..... وہی ہوگا..... اس دوران میں علاقے میں اپنی زمین، جائداد وغیرہ فروخت کر کے یہاں اچھا سا گھر لے لوں گا تمہارے لائق..... کیا پتا تب تک گل بھی آجائے..... تو پھر میں اماں کو بھیج دوں نا....." اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور پھر اگلے ہی روز میران اماں نے آکر ابا کے سامنے اپنا مدعا بیان کر کے انہیں سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا اور ابا نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے کاؤنٹر پر پڑے چائے کے کپ کو دیکھا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے رگڑ ڈالا۔ یہ صرف نوشیرواں کی خواہش تو نہیں تھی، وہ خود بھی تو نوشیرواں کے سنگ ہی زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن یہ بات وہ ابا سے نہیں کہہ سکتی تھی کبھی نہیں۔

وہ ابا کو یہ موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ کہیں کہ ان سے الگ ہو کر روحی اور اماں نے اس کی صحیح تربیت نہیں کی اور پھر روحی کی وجہ سے ابا کتنے بکھر گئے ہیں۔ وہ اپنی طرف سے انہیں دکھی نہیں کر سکتی تھی..... وہ نوشیرواں کے لیے اور اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی..... یکدم اندر گرتے آنسو باہر آنے کو بے تاب ہونے لگے تو وہ کچن کا دروازہ کھول کر باہر نکلی..... ابا کہیں جا چکے تھے اور اماں سبزی کی ٹوکری سامنے رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ آہٹ پر انہوں نے بسمل کی طرف دیکھا تو بسمل ان سے نظریں چرائے تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

☆☆☆

نوشیرواں میراں اماں کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے لیٹا تھا اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"میں تمہیں اس دکھ سے بچانا چاہتی تھی اس لیے میں نے۔"

"میں جانتا ہوں اماں جان۔"

"یہ بہت مشکل تھا شیری ..... میرا بھی جی چاہتا تھا کہ سمل میری بہو بنے..... میرے شیری کی دلہن۔ وہ مجھے بالکل اپنی زینے کی طرح لگتی تھی لیکن میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔"

"لیکن میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں اماں جان؟" بند آنکھوں کے پیچھے مچلتے آنسوؤں کو روکتے ہوئے نوشیرواں نے سوچا۔

"بہت سی چیزیں ہمیں اچھی لگتی ہیں شیری بچہ لیکن ہم انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ہمیں دل مارنا پڑتا ہے۔"

"لیکن سمل چیز تو نہیں ہے اماں جان... " نوشیرواں نے تڑپ کر آنکھیں کھولی تھیں۔ "وہ تو میرے دل کی آرزو ہے۔"

"سب آرزوئیں بھی پوری نہیں ہوتیں بیٹا۔" انہوں نے اس کی بے حد سرخ آنکھوں کو دکھ سے دیکھا۔ "دل تو اکثر لاحاصل چیزوں کی آرزو بھی کرنے لگتا ہے بچے۔"

"کیوں.....؟ بھلا کیوں ایسی آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں دل میں جنہیں پورا نہیں ہونا ہوتا۔" نوشیرواں نے یہ سوچتے ہوئے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔ میراں اماں اسی طرح اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں اور ان کی آنکھیں نم ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر سمل اپنے ابا سے کہتی، انہیں اپنی مرضی بتاتی تو کیا وہ اس کے اور نوشیرواں کے متعلق نہیں سوچتے لیکن اس نے تو لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیے۔

"نہیں، میں ابا سے یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتیں سمل؟" نوشیرواں بے حد مضطرب اور بے چین تھا۔

"میں ابا کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔" اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

"اور کیا خود کو دکھ دے لوگی؟" نوشیرواں [illegible] ہوا تھا۔ وہ صبح صبح ہی ملنے چلی آئی تھی۔ میراں [illegible] کچن میں تھیں اور وہ کھڑکی سے ٹیک لگائے نوشیرواں کے کمرے میں کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ سمل۔" نوشیرواں کو احساس ہوا کہ وہ جب سے آئی ہے کھڑی ہے لیکن سمل اسی طرح میز سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ میراں اماں [illegible] آئی تھیں تو اماں نے مختلف پھر اور ماحول کی بات سے معذرت کر لی تھی اور میراں اماں کے جانے کے بعد نوشیرواں نے اسے کتنے ہی فون کیے تھے لیکن انہیں اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ اس میں نوشیرواں سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا اسے سنبھلنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے نوشیرواں سے بات کر لی تو وہ خود بکھر جائے گی اسے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہے گا۔

"پلیز نوشیرواں، میں بات نہیں کر سکتی آؤں گی۔" اس نے نوشیرواں کو میسج کیا تھا۔ [illegible] وہ اس کے سامنے تھی۔

"میں جانتا ہوں تم خوش نہیں رہ سکو گی [illegible] بار صرف ایک بار ان سے بات کر کے تو دیکھو۔"

"نہیں۔" سمل کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

"میں اپنا بھرم نہیں کھو سکتی ..... میں مروان [illegible] لیے ایک بھی غلط بات نہیں سن سکتی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ ابا کے دل میں یہ خیال تک بھی آئے مروان نے مجھے بہت آزادی دے رکھی تھی۔ نوشیرواں مجھے معاف کر دیں۔ میری ذات آپ کے لیے دکھ کا باعث بنی حالانکہ میں نے تو ہمیشہ آپ کو سکھ دینے کا ہی سوچا تھا۔ میں تو آپ کے غم بانٹنا چاہتی تھی میں تو آپ کے آنسو پونچھنا اور آپ کے ساتھ مل کر رونا چاہتی تھی لیکن نجانے میں دکھ دے بیٹھی۔"

"دکھ... ؟" نوشیرواں کے لبوں پر زخمی سی مسکراہٹ ابھری۔ "دکھ تو بہت معمولی لفظ ہے لوگی میرا تو دل ہی خالی ہو گیا ہے۔" اور سمل جو اب تک ضبط کیے بیٹھی تھی یکدم رو پڑی۔ نوشیرواں بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ چلی گئی۔ وہ کتنی ہی دیر تک خالی دروازے کو تکتا رہا۔ کمرے میں اس کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر میراں اماں آ گئیں انہوں نے اس کا سر سینے سے لگا کر اس کا سر ہمیشہ کی طرح چوما تھا پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

"میں اسی دن سے ڈرتی تھی شیری..... اور مجھے اسی بات کا خوف تھا۔" نوشیرواں کا دل چاہا تھا وہ میراں اماں کے گلے لگ کر بہت سا رو لے۔ وہ تو اتنی بہادر مرد بہ مشکل اپنے آنسو روک پا رہا تھا۔ دل تو خالی تھا تب سے جب سب نے اکٹھا دوسری دنیا کی راہ لی تھی اور اس خالی دل میں بس ایک آس کا دیا جلتا تھا۔ کل سے ملنے کی آس..... پھر نہ جانے کہاں سے اس خالی دل میں بہاروں کی خوشبو بھر گئی۔ وہ بھی سہمی سہمی خوف زدہ سی لڑکی دل کے خالی آنگن میں آزادی سے گھومنے لگی اور بار بار اسے بہار کا پیام دینے لگی۔ میراں اماں بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں اور وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں کہ مبادا آنکھوں کے پیچھے آنسو مچلتے تھے اور باہر آنے کو بے تاب ہوتے تھے۔

"شیری تو تو میرا بہت بہادر بچہ ہے..... میرا ننھا جوان۔" ان کی انگلیاں اب بھی اس کے بالوں میں تھیں اور مامتا بھرا لمس اسے سکون دے رہا تھا۔

"اکثر حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں لیکن انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے قبول نہ کرنے سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی..." سیمل بہت پریشان تھی..... بہت روری تھی۔ "تمہیں تو اسے حوصلہ دینا چاہیے تھا الٹا خود حوصلہ ہار بیٹھے۔ بچیاں تو ایسے ہی ہوتی ہیں کمزور، نازک دل مگر تو بہادر فوجی ہے ناں۔"

"ہاں بہادر فوجی۔" اس نے آنکھیں موندے موندے دل میں اعتراف کیا.... "اور ہمیں سکھایا گیا ہے کہ ہمیں اپنی آخری سانس تک جنگ لڑنی ہے۔ سیمل نے ہتھیار پھینک دیے ہیں لیکن میں ہتھیار نہیں پھینکوں گا ... میں اپنی جنگ خود لڑوں گا۔ آخری سانس اور آخری امید تک۔" اس نے اپنے ہاتھ میراں اماں کے ہاتھوں پر رکھ دیے اور آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

"اماں جان میں ٹھیک ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "آپ پلیز جا کر آرام کریں۔" انہوں نے بغور اسے دیکھا اور پھر بولیں۔

"میری جھولی میں صرف تم ہو شیری اور ایک آس ہے کل کے ملنے کی آس۔ مجھے تہی دامن مت کرنا شیری بیٹے۔"

"میں ایسا کچھ نہیں کرنے والا اماں جان۔ آپ وہم نہ کریں۔ بس کچھ دیر آرام کروں گا۔" وہ ہولے سے ہنسا اور ان کا ہاتھ دبایا۔

"آئی ایم اوکے اماں جان۔" اس کی آنکھوں میں چھپے کرب کے پیچھے کسی عزم کی جھلک تھی جو میراں اماں کو محسوس ہوئی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس کی خوشیوں اور سکون کی دعا کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلی آئیں اور بیڈ پر لیٹ کر تکیے پر سر رکھتے ہوئے نوشیرواں نے زیر لب کہا۔

"میں ایک سپاہی ہوں اور میں زندگی کی آخری سانس تک جنگ لڑوں گا اپنی بقا کے لیے۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔ باہر میراں اماں بے وقت ہی نفل پڑھے جا رہی تھیں اور دعا کر رہی تھیں کہ شاید کوئی در قبولیت کھل جائے اور ان کے شیری کا خالی دل بھر جائے۔

☆☆☆

سیمل نے حسان کو تھپکتے ہوئے نوشیرواں کی طرف دیکھا جس کی نظریں ٹی وی پر تھیں لیکن وہ ٹی وی نہیں دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں۔" ایک افسردہ سی مسکراہٹ نوشیرواں کے لبوں پر نمودار ہوئی اور اس نے تکیے کے پاس رکھا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا اور کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے سیمل کی طرف دیکھا۔

"حسان سو گیا کیا؟" سیمل نے سر ہلایا اور گود میں لیٹے حسان کو اٹھا کر کاٹ میں لٹا دیا اور نوشیرواں کے قریب بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"ٹی وی کیوں بند کر دیا۔ کیا کوئی خاص پروگرام نہیں آ رہا۔" نوشیرواں نے نفی میں سر ہلایا اور سیمل کی طرف دیکھا۔ "ایک اور سال بیت گیا سیمل۔ کل سال کی پہلی صبح ہوگی جنوری 2012ء کی صبح لیکن بیتے سالوں میں کیا ہوا سیمل کچھ بھی تو نہیں بلکہ ہمارے لیے ہم پاکستانیوں کے لیے زندگی اور مشکل ہو گئی ہے۔ ڈرونز، دہشت گردی، خود کش حملے، ٹارگٹ کلنگ، مہنگائی، کرپشن، لوڈ شیڈنگ، بے انصافی، ظلم ... کیا ہوگا اس ملک کا سیمل۔" ان بیتے سالوں میں اجتماعی سطح پر کوئی خوشی کی خبر نہ تھی۔ ہاں انفرادی خوشیاں تھیں اس کی زندگی میں سیمل شامل ہوئی وہ اپنی جنگ جیت گیا تھا۔ سوائے اپنی آبائی حویلی کے کھنڈرات کے اس نے علاقے میں اپنی ساری زمین بیچ دی تھی اور یہاں اقبال ٹاؤن میں ایک کنال کا گھر خرید لیا تھا۔ وہ اکثر حبیب خان سے ملنے چلا جاتا

اس کے بعد راتیں ہموار ہوتی گئیں ایک روز وہ حبیب خان کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"میں مردان نہیں ہوں لیکن آپ مجھے اپنا مردان ہی سمجھیں۔ سیمل کے لیے آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے اور سیمل کو قبول ہوگا۔ سیمل آپ کی بیٹی ہے اور آپ اس کے لیے فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے کسی بھی فیصلے سے انحراف نہیں کرے گی لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار پھر سوچیے گا ضرور... میں نے ہمیشہ کے لیے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے پھر بھی آپ مجھے سیمل کے قابل نہیں سمجھتے تو آپ کو حق ہے مجھے ریجیکٹ کر دیں۔" حبیب خان خاموش رہے تھے۔ اس ایک سال میں وہ ان کے بہت قریب آ گیا تھا وہ اس سے بہت ساری باتیں شیئر کرنے لگے تھے اس سے بہت سارے معاملات میں مشورہ کرنے لگے تھے وہ اس پر روحی کی طرح ہی اعتبار کرنے لگے تھے۔ کبھی کبھی دن وہ نہ آتا تو وہ اسے ملنے کو بے چین ہو جاتے۔ سو انہوں نے نوشیرواں کے حق میں فیصلہ دے دیا اور یوں سیمل اس کی زندگی میں آ گئی۔ ان خوشیوں کو پائیدار کرنے کے لیے حسان بھی آ گیا۔ اماں اب کافی بہتر بلکہ بالکل ٹھیک تھیں۔ وہاں اب بچے بھی آنے لگے تھے۔ یہ چھوٹی چھوٹی انفرادی خوشیاں تھیں لیکن باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہ بہت افسردہ ہو جاتا تھا۔ 2011ء گزر گیا تھا۔ وہ اب بھی ایک دوسرے کو محسن نقوی کی نظم سناتے تھے۔

کبھی سپنوں میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں
جہاں چاند مدھم نہ ہو کبھی

اب بھی ان کے دل میں ایسا شہر بسانے کی خواہش چھپی ہوئی تھی جہاں یہ سب کچھ نہ ہو۔ یہ فرقہ، بم دھماکے، خود کش حملے ایسا شہر، ایسا ملک، جہاں سکون ہو، امن ہو، خوشحالی ہو، انصاف ہو

امد جہاں لوگ مطمئن اور خوش ہوں۔ آج چار سال بعد بھی وہ گل کے پلٹ آنے کا انتظار کرتے تھے اور اس کے سلامت لوٹ آنے کی دعائیں کرتے تھے۔ آج بھی گل سے متعلق کہیں کوئی خبر نہیں ملتی تھی۔ میراں اماں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتیں تو پھر کتنی ہی دیر اٹھائے رکھتیں اور آنسو ان کے ہاتھوں کے پیالے میں گرتے رہتے۔ سیمل اور نوشیرواں اب بھی کسی نہ کسی اتوار کو اناركلی جاتے اور حاسو چاچا نے ان کے لیے اچھی اچھی کتابیں الگ کر کے رکھی ہوتیں اور وہاں سے واپس آکر آج بھی سیمل سوچتی تھی۔

"حاسو چاچا اشفاق احمد کا بابا نہیں ہیں لیکن لگتا ہے۔" کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کوئی اچھی اور خوش کن تبدیلی لیکن وہ خواب تو دیکھ سکتے تھے اچھے دنوں کے خواب سو وہ دیکھتے تھے۔

"سیمل صبح میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔" بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نوشیرواں نے باہر جاتی سیمل سے کہا۔

"کیوں؟"

"سنا ہے لاپتا افراد کے لواحقین کوئی ریلی نکال رہے ہیں۔"

"آپ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔"

"پتا نہیں جانا چاہتا ہوں یا نہیں۔" وہ بے حد تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ "لیکن سیم تم جانتی ہو ناں گل میرے نانا کی نسل کا امین ہے۔ بچ جانے والا میرا واحد رشتے دار...... ہمارے علاقے کے بہت کم افراد لاپتا ہوئے ہیں۔ دو تین یا شاید چار...... لیکن وہاں اسلام آباد میں جب جب گیا مجھے لگا میرا دل یہاں ہی پھٹ جائے گا۔ وہاں ان لاپتا افراد کے بے شمار لواحقین چھوٹے چھوٹے بچے ہاتھوں میں بینرز اٹھائے جھکے کندھوں اور ٹوٹی کمروں والے بوڑھے والدین۔ میں انہیں دیکھنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا...... ان کے مایوس چہرے، ویران آنکھیں لیکن میں کیا کروں سیمل۔ میں ایسا کوئی موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا۔ وہ ملے نہ ملے میں آس کی ڈور ٹوٹنے نہیں دینا چاہتا اپنی آخری سانسوں تک...... اور جب میں نہیں رہوں گا تو اپنی یہ آس اپنے بچوں کے دل میں چھوڑ جاؤں گا کہ شاید ― شاید کبھی میرے نانا کی نسل کا امین لوٹ آئے۔" اس نے آہستگی سے کہا اور سیمل کی طرف دیکھا۔

"سیم......! مجھے وہ نظم سناؤ اپنی نرم دلکش اور خوب صورت آواز میں۔ جو مروان کو پسند تھی جو گل کو پسند تھی اور جو شاید ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔ میں کچھ دیر کے لیے خواب دیکھنا چاہتا ہوں سیمل۔"

سیمل بیٹھ گئی وہ جانتی تھی کہ جب بھی گل کے آنے کی امید دم توڑنے لگتی تھی تو وہ یونہی نڈھال ہو جاتا تھا۔

"ہاں سیم بولو ناں۔" اس نے تکیے پر سر رکھے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ سیمل نے آہستگی سے سنانا شروع کی۔

"میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں
جہاں سچ کو سچ سے ہو واسطہ
جہاں جگنوؤں کو ہو اور دکھاتی ہو راستے
جہاں......"

سیمل نظم سنا رہی تھی اور اس کی بند آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کا دریا موجزن تھا۔ خمار بھیگتی جا رہی تھی اور لاؤنج میں جا نماز پر بیٹھی ماسی میراں اماں کے آنسو دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کے کٹورے میں گرتے جاتے تھے اور نگاہیں آسمان پر جمی تھیں جانے کب در قبولیت وا ہو...... جانے کب......

(ختم)